جلد ۸۴ ستمبر ۱۹۷۵ء عدد ۱

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۱	ستمبر ۱۹۷۵ء مطابق شعبان ۱۳۹۵ھ	جلد ۸۴

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک ، اچھرہ - لاہور

زرسالانہ بارہ روپے - فی پرچہ ۱/۲۵ روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صہیونی اسرائیلیوں کی مسلم آزاری

(یروشلم کے مقاماتِ مقدسہ کی تخریب و توہین)

از جناب نعیم صدیقی صاحب

یہودیوں کے تاریخی کردار کا جائزہ لینے کے لیے میں کچھ عرصہ سے ایک مختصر سے مطالعاتی و تحقیقی منصوبے پر کام کر رہا ہوں۔ مطالعہ سے حاصل شدہ مواد مسالہ ایک انبار کی صورت میں جمع ہو گیا ہے۔ مزید مطالعہ (جس کا خاکہ بنا رکھا تھا) کا سلسلہ میں نے اس لیے روک دیا ہے کہ جو اہم معلومات و اقتباسات اب تک فراہم ہیں انہی کو ایک مقالے میں سمونا دردِ سر بن گیا ہے، کجا کہ اس کاغذی بوجھ میں مزید اضافہ کروں۔ میرا حال اُس مسافر کا سا ہے جسے متعدد مصروفیات دائیں بائیں سے گھیرے ہوئے ہوں اور جس کے سر پہ وقت کی کمی کے احساس کا کوڑا بار بار لہرا رہا ہو۔

اسی دوران میں الخلیل میں مسجد ابراہیمی کے خلاف اسرائیلیوں کی دراز دستی کا قضیہ اخبارات میں چھڑ گیا متعلقہ خبری مواد (اور بعض مضامین) کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ مسلم آزار صہیونیت کی طرف سے فلسطین، خصوصاً یروشلم میں مسلمانوں کے مقاماتِ مقدسہ اور مذہبی ادارات پر ہونے والی چیرہ دستیوں اور بد مستیوں کے متعلق ہمارے یہاں کچھ زیادہ معلومات اشاعت میں نہیں آسکیں۔ میں نے اپنے جمع کردہ مواد میں سے خاص اس موضوع پر اقتباسات لے کر یہ مقالہ مرتب کیا ہے۔ آج (مورخہ ۲۱ اگست) جبکہ یوم مسجد اقصیٰ منایا جا رہا ہے۔ میں ان اوراق کو اشاعت کے لیے ادارہ ترجمان القرآن کے حوالے کر رہا ہوں۔

چند تمہیدی اشارات میں کسی تعصب کے بغیر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قوم یہود جس کے کردار کی تصویر انجیل اور خود تورات میں بڑی عبرت آگیں دکھائی دیتی ہے، اور جس کے خلاف قرآن نے امامتِ اقوام اور شہداء علی الناس ہونے کے مقدس منصب سے معزولی کا فیصلہ دیتے ہوئے بہت ہی جامع اور مسکت چارج شیٹ لگایا ہے، اس

کا مجموعی تاریخی پارٹ میرے مطالعہ کی رُو سے بے حد گندہ اور مکروہ ہے۔ اس گروہ نے انسانیت کے بہترین فکری، اعتقادی، اخلاقی اور تہذیبی خزانوں کی بُری طرح لُوٹ مچائی ہے اور اسے یہ کریڈٹ حاصل نہیں ہے کہ اس نے انسانی صلاح و فلاح کے لیے کوئی قابلِ قدر خدمات انجام دی ہوں۔

تورات کے یہود کا بگاڑ ہی کچھ کم نہ تھا، لیکن ایک ہزار سالہ دور گذار کر تورات کو گم اور مسخ کر دینے کے بعد یہودِ تلمود جس نئے سانچے میں ڈھل کر نمودار ہوئے اُس نے انہیں کچھ کا کچھ بنا دیا۔ تلمود کا دیا ہوا تصوّرِ خدا (جس کے سامنے عقیدۂ آخرت موجود نہیں ہے) بے حد مضحکہ انگیز ہے، اور اسی کے مطابق اُن کا تصوّرِ انسان اتنا خلافِ انسانیت ہے کہ اسے لے کر چلنے والی قوم اپنے دائرے کے باہر کے لوگوں کو نفرت و اذیّت کے سوا کچھ نہیں دے سکتی۔ تلمودی تعلیم یہود کو یہ سکھاتی ہے کہ تم خدا کے چہیتے اور لاڈلے ہو (خواہ تمہارے اعمال کیسے ہی ہوا کریں) اور باقی تمام انسان حیوانات (خنازیر، حشرات اور چوپائے) ہیں جن کو انسانی شکل اس لیے دی گئی ہے کہ تم (یعنی یہود) اُن سے خدمات لے سکو۔ غیر یہودیوں کے لیے گدھوں اور کتّوں کے الفاظ بھی استعمال کیے گئے ہیں[1]۔

حد یہ کہ تلمود کے خدا کی طرف سے یہود کو تخریبِ انسانیت کے لیے یہ کھلا لائسنس دیا گیا کہ وہ (غیر یہودیوں کی ہر استوار عمارت کو مسمار کر دیں، ہر پاک کردار کو داغ لگائیں، تمام سرسبز نباتات کو جلا دیں، جہاں تک ان کی تلواریں کی پہنچ ہو، مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو قتل کر دیں اور تمام غیر یہودی مذہبی پیشواؤں پر ہر روز لعنت برسائیں[2]۔ چنانچہ اسی بنا پہ سرمایے سے اکابر کے ضمیر خریدنے، جھوٹا پروپیگنڈا کرنے، مخالفین کو قتل کرنے، بچوں کا خون نکالنے اور جنگی حریفوں سے غیر انسانی سلوک کرنے کے جرائم ان میں فروغ پاتے چلے گئے۔

مسلمانوں کے خلاف یہود کے زہریلے جذبات

یہود کو جملہ غیر یہودیوں سے عمومی عناد رہا ہے، اور جس ملک میں یہ رہے وہاں کے باشندوں کے لیے ان کا وجود عذاب بن گیا، لیکن علی الخصوص اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس گروہ کا تاریخی اعمال نامہ پورے کا پورا سیاہ ہے۔ یہودیوں کی مسلم دشمنی کا آغاز نبی آخر الزمانؐ کے دور ہی سے بڑے زور شور سے ہوا۔ انہوں نے عقائد و احکام میں کٹ حجتیاں کیں، معاہدے توڑے، حضورؐ کے خلاف قتل کی

[1] الاستاذ نمر الخطیب۔ حقیقۃ الیہود والمطامع الصہیونیہ (مطبوعہ بیروت) ص ۱۶۔

[2] ایضاً، ص ۲۳۔

سازشیں بار بار کیں، جادو کے ٹونے ٹوٹکوں سے کام لیا، جنگی مواقع پر غداریاں کیں اور مسلمانوں کی جماعت کے حصار میں منافقین کو داخل کیا۔ پھر انہی لوگوں نے شکست کے انتقام کی آگ میں سلگتے مجوسیوں کا تعاون حاصل کرکے وہ سازشی فضا تیار کی جس میں تین خلفائے راشدین کی شہادت واقع ہوئی، دورِ عثمانیؓ میں اسی سازشی فضا کے بطن سے فتنوں نے جنم لیا اور یہی فتنے دورِ مرتضویؓ میں پورے برگ و بار لائے، یہاں تک کہ امام حسینؓ کے سر سے خون کی لہر گذر گئی اور ملت اسلامیہ کے حفاظتی بند کے اُس آخری ٹکڑے کو توڑ کر عجمی بادشاہت مسند آرا ہو گئی۔ یہی وہ دور ہے جس میں عبد اللہ بن سبا نے اعتقادی تخریب کے لیے تفرقہ کے ایسے بیج مسلمانوں میں بوئے کہ آج تک ہمارے یہاں فصلِ افتراق اُگتی چلی آتی ہے اور مسلسل کانٹے پھیلاتی ہے۔ اس شخص نے وہ راستہ کھولا جس سے خارجیت، باطنیت، بہائیت، بابیت، قادیانیت اور انکارِ سنت جیسے تباہ کن فتنے مسلم معاشرے میں داخل ہوتے رہے[۵]۔ تاریخ میں دوڑ دھوپ کرکے مختلف اشخاص سے ملنے اور مختلف اشقلے اُٹھانے اور وحدتِ اسلامی کو ختم کرنے کے لیے اس کی حرکات کا ریکارڈ ہے۔

بیچ کی تاریخ کی تفاصیل دینا مشکل ہے۔ بس یہود کی مسلمانوں پر اس آخری بڑی کرم فرمائی کی یاد تازہ کرنا ضروری ہے کہ یہی لوگ سلطان عبد الحمید کی معزولی کا باعث بنے کیونکہ سلطان نے یہودیوں کی طرف سے بھاری قیمت کی پیشکش کے باوجود فلسطین کو ان کے ہاتھ بیچنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ یہ میری ملک نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی امانت ہے اور اس کا ایک بالشت بھر ٹکڑا بھی کسی کو دینے کا مجھے اختیار نہیں ہے۔ اور پھر انہی یہود نے کچھ باہر سے اثرات ڈال کر، کچھ فری میسن تحریک کے پردے میں سازش کرکے، اور کچھ اپنے دونمہ گروہ (ظاہراً مسلمان، اندر سے یہودی) کو مسلمانوں کے اندر گھسا کر ترک نوجوانوں کو اتحاد و ترقی کے جھنڈے تلے الحاد و تجدد اور

---

۵ عبد اللہ بن سبا کے متعلق حسب ذیل کتب ملاحظہ ہوں:۔

(۱) الطبقات الکبریٰ لابن سعد، المجلد الثالث مطبوعہ بیروت ۱۹۵۷ء ص ۳۲۵۔ (۲) البدء والتاریخ ۵: ۱۲۹۔

(۳) المیزان ۳: ۲۹۹ (۴) تہذیب ابن عساکر ۷: ۴۲۸

(۵) MARYAM JAMEELAH ISLAM VERSUS AHLUL KITAB PP. 78, 309.

مغربیت کی راہ پر ڈال اسلام کے بچے کھچے آثار کو ملیامیٹ کرنے کے لیے استعمال کیا[۱]۔ سازش کی اس چکی میں مسلمانوں کی نہایت قیمتی شخصیتیں پس گئیں، حتیٰ کہ انور پاشا جیسے خادمِ اسلام کے لیے جدید ترکی کی فتح شکست کا پیغام لائی، اور ترکی کی بہت سی قوت بعد کے سالوں میں اسلام اور مغربیت کی کشمکش میں کھپ گئی، جس کا سلسلہ ابھی تک پوری طرح ختم نہیں ہوا۔

تاریخِ ماضی کے بعد تاریخِ مستقبل کی ایک جھلک اُن توسیعی عزائم میں دیکھی جا سکتی ہے جن کی زد میں مسلم ممالک اور خاص طور پر مدینہ طیبہ جیسا مقدس مقام آتا ہے۔ ۱۸۹۶ء میں صہیونیت کے بانی مبانی تھیوڈور ہرزل (THEODORE HERZL) نے اپنی کتاب یہودی ریاست (DER JUDENSTAT) میں لکھا ہے کہ ریاست کی شمالی سرحدیں ترکی میں (CAPADOCIA) کے سامنے تک ہوں گی اور جنوب میں نہر سویز تک[۲]۔ پیرس کی امن کانفرنس ۱۹۱۹ء کے سامنے صہیونی وفد نے مجوزہ ریاست کا جو خاکہ پیش کیا وہ پورے فلسطین، اردن، شام کی گولان کی پہاڑیوں، جنوبی لبنان اور سینا کے کچھ علاقوں پر مشتمل تھا[۳]۔ سابق صدر امریکہ روزویلٹ کے ذریعے سلطان عبدالعزیز ابن سعود کو اس مقصد کے لیے مالِ کثیر کی ناکام پیشکش کی گئی کہ یہود کو نیل اور فرات کے درمیانی علاقے اور شمالی حجاز مع مدینہ منورہ پر قبضہ کرنے دیا جائے[۴]۔ اپریل ۱۹۴۸ء میں امریکی جریدہ نیویارک ٹائمز میں ایک یہودی لیڈر (ابن بحنت) نے مقالہ لکھا جس میں اس مقصد کے لیے ایک مضبوط فوج کی تیاری کی دعوت دی گئی کہ مدینہ منورہ پر قبضہ کر کے (نعوذ باللہ) مسجد نبوی اور روضۂ مقدسہ کو ڈھا دیا جائے، تاکہ عربوں اور مسلمانوں کو ذلیل کیا جا سکے۔ یہودیوں کی طرف سے صاف الفاظ میں کہا گیا کہ ہم وہاں (مدینہ و خیبر) سے مسلمانوں کو نکال باہر کریں گے، جہاں سے مسلمانوں نے ہم کو نکالا تھا[۵]۔

اسرائیلی ریاست کے قیام کے بعد یہودی حکومت کے زیرِ اہتمام مسلمانوں کی دل آزاری کی بے حد شنیع حرکت

---

[۱] یہ قصہ عرب مصنفوں کی کتابوں کے علاوہ بہت سی مغربی کتابوں اور رپورٹوں میں بڑی وضاحت سے درج ہے۔ ضرورت کے لیے صرف ایک حوالہ: الاستاذ نمر الخطیب۔ حقیقۃ الیہود ..... ص ۴۴ تا ۴۶۔

[۲] PROF. ISMAIL ZAYID - PALESTINE A STOLEN HERITAGE (1974) P-18

[۳] IBID P-18

[۴] الاستاذ محمد الغزالی .... الاستعمار ص ۳۸۳

[۵] بن گوریان ۱۹۴۸ء (حوالہ لازم و فاروقی)

یہ ہوئی کہ نہایت اعلیٰ درجے کے کاغذ پر مغربی جرمنی سے قرآن کا تحریف شدہ نسخہ طبع کرایا گیا اور پھر مسلم ممالک میں تقسیم کر دیا گیا۔ عربی اخبار الدعوۃ ۔ ۱۵ جولائی ۱۹۶۸ء کے بیان کے مطابق حقیقت کا انکشاف ہونے پر اضطراب پھیلا اور صرف انڈونیشیا میں یہودی قرآن کی ۲۵ ہزار کاپیاں جمع کر کے تلف کی گئیں۔[1]

ادھر حال ہی میں شرائنرز (SHRINERS) کی رکیک حرکت برسرعام آئی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے اچھا اور معلوماتی مضمون کیپٹن ممتاز ملک کے قلم سے شائع ہوا ہے۔ شرائنرز کی تنظیم فری میسن تحریک کی ایک شاخ ہے اور اس کا ایک بڑا مقصد مسلمانوں کی دلآزاری ہے۔ اگرچہ اپنی مقبولیت بڑھانے کے لیے یہ چندے جمع کر کے اپاہج بچوں کے لیے ۲۲ ہسپتال چلا رہی ہے۔ اس کا آغاز کینیڈا کے شہر ٹورنٹو سے ہوا۔ آجکل اس کا بین الاقوامی ہیڈ کوارٹر شکاگو میں ہے۔ اس کے تحت ۲۵ ہزار کلبیں، ۱۷،۴ روحانی معابد (SHRINES) سے منسلک ہیں۔ سالانہ بجٹ قریباً ۴ کروڑ ۲۰ لاکھ ڈالر ہے۔ اس میں بہت بڑے بڑے اکابر شامل ہیں اور امریکہ کے بیشتر صدر تک شریک ہوتے ہیں۔ مندروں یا معابد کے نام مسلم مقامات مقدسہ اور محترم شخصیتوں کے ناموں پر رکھے گئے ہیں۔ مثلاً مکہ، مدینہ، مسلم، ولی، القرآن، محمد، علی، صلاح الدین وغیرہ۔ اپنے جلوس میں یہ ایسی ٹوپیاں پہنتے ہیں جن پر ایسے نام درج ہوتے ہیں جو مسلمانوں کے لیے محترم ہیں، اور پھر یہ شراب نوشی اور رقص اور دوسری بیہودہ حرکات کرتے ہیں۔[2]

پاکستان کے متعلق یہود کے عزائم بد | یہود کی مسلم دشمنی کا بیان طویل ہو گیا، مگر بس ایک چیز اور درج کرنا ضروری ہے۔ صہیونیت نواز اسرائیلی پاکستان کے بارے میں جو نقطۂ نظر رکھتے ہیں، وہ یوں تو ایک واضح حقیقت ہے، مگر ذمہ داری کے مقام سے ذیل کا قطعی اعلان ایسا ہے کہ اس سے ہر پاکستانی کو باخبر ہونا چاہیے۔

برطانیہ میں صہیونی تحریک کے ترجمان یہودی جریدے جیوئش کرانیکل مورخہ ۹ اگست ۱۹۶۷ء میں بن گوریان کا ایک لیکچر شائع ہوا جو ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیلی جنگ کے بعد پیرس کی ایک یونیورسٹی میں دیا گیا۔ اس میں واشگاف طور پر کہا گیا کہ:۔

”عالمی تحریکِ صہیونی کو پاکستان کی طرف سے درپیش خطرے سے غافل نہ ہونا چاہیے ...... اب

۱؎ ملاحظہ ہو: M. W. GARDIN – VOICE OF ISLAM V. XVII, NO: 3, P. 6.

۲؎ نوائے وقت ۱۰ اگست ۱۹۷۵ء

پاکستان اس تحریک کا اوّلین ہدف ہونا چاہیے ، کیونکہ یہ اُصولی ریاست (IDEALOGICAL STATE) ہماری بقا کے لیے خطرہ ہے ...... پاکستان سرتاسر یہودیوں سے نفرت کرتا ہے اور عربوں سے محبت رکھتا ہے ۔ عربوں کی یہ (پاکستان کی طرف سے) محبت ہمارے لیے خود عربوں سے زیادہ خطرناک ہے ۔ اس بنا پر عالمی صہیونیت کے لیے حد درجہ لازم ہے کہ اب وہ پاکستان کے خلاف فوری اقدامات کرے۔"

(اس اعلان اور پاکستان کے دولخت ہونے میں صرف سوا تین سال کا دفعہ ہے ۔ صدیقی)

اس کے ساتھ گوریان صاحب اس قوت کی طرف توجہ فرماتے ہیں جس سے تعاون کرکے پاکستان کو ہدف بنایا جا سکتا ہے ۔

ہندوستانی جزیرہ نما کے باشندے ہندو ہیں ، جن کے دل پچھلی تمام تاریخ میں مسلمانوں کے خلاف نفرت سے بھرے رہے ہیں ۔ اس لیے انڈیا پاکستان کے خلاف کام کرنے کے لیے ہمارے حق میں بہترین میدان ہے ۔ یہ ضروری ہے کہ ہم اس میدان کا رسے پورا فائدہ اُٹھائیں اور پاکستانیوں پر ضرب لگا کر ان کو کچل دیں ، جو اپنے کھلے اور چھپے منصوبوں کی رُو سے یہودیوں اور صہیونیت کے دشمن ہیں۔[1]

اسرائیلی ریاست کا پورا وجود مسلم دشمنی کا مظہر ہے

اسرائیلی ریاست صہیونیت اور برطانیہ کے ساز باز کی ناجائز اولاد ہے ۔ بقول گلب پاشا ایک وطن اصل آبادی سے چھین کر غیر ملکیوں کے حوالے کر دیا گیا۔[2] ۱۹۶۱ء تک گیارہ لاکھ سے زائد عرب نکالے گئے اور ۱۶ لاکھ یہودی باہر سے لائے گئے۔[3] ۱۹۱۸ء میں فلسطین میں مسلمان عربوں کی آبادی ۵ لاکھ ۴۷ ہزار ، عیسائی عربوں کی ۷۰ ہزار اور یہودیوں کی ۵۶ ہزار تھی ۔ کل آبادی میں یہود کا تناسب صرف ۸ فیصد تھا ۔ ۱۹۴۶ء میں اسرائیلی ریاست بننے سے پہلے ہی آبادی کا نقشہ یوں تبدیل ہو گیا : عرب مسلمان (نسلی اضافہ) ۱۲ لاکھ ۳۷ ہزار ۸ سو ۳ ۔ عیسائی عرب ۱ لاکھ ۴۵ ہزار ساٹھ ۔ یہودی ۶ لاکھ ۸ ہزار دو سو تیس اور دوسرے لوگ دس ہزار ایک سو ایک ۔ یعنی یہودی ۳۱ فیصد ہو گئے ۔ مسلمان اور عیسائی عربوں کا مجموعی تناسب ۹۲٪ سے گھٹ کر ۶۹٪ ہو گیا ۔ اور اب ۱۹۷۰ء میں یہودی آبادی ۱۹ لاکھ ۲۰ ہزار ۲ سو ساٹھ

---

[1] QUTUBUDDIN AZIZ MISSION TO WASHINGTON (KARACHI, JANUARY 1973) P 58

[2] مشرقِ وسطیٰ کے زخم (اُردو ترجمہ از آبادشاہ پوری) ص ۵۸ ۔

[3] ملاحظہ ہو ۔ A STATEMENT OF ARAB DELEGATION (BEFORE U.N.O) PP. 8, 9.

تک پہنچ گئی ہے جس کا تناسب ۸۰ فیصد ہے[1]۔ ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۶ء کے اعداد و شمار سے واضح ہے کہ مسلمان عربوں کا تناسب بہت زیادہ ہے اور ظلم کا زیادہ سے زیادہ نشانہ وہی بنے ہیں۔

ان کو فلسطین سے نکالنے اور ان کی زمینیں چھیننے کے لیے متعدد مستبدانہ قانون بنا کر اُن کو غیر قانونی طریقوں سے استعمال کیا گیا۔ ستمبر ۱۹۵۳ء میں اسرائیلی وزارت مالیات نے ۴۵ ایسے احکام جاری کیے جن کی رُو سے شمالی فلسطین کی ۴۰ دیہی آبادیوں میں عربوں کے بڑے بڑے قطعات اراضی ان سے چھین لیے گئے جن کی مجموعی مقدار ۳۰ ہزار ڈونم (DUNUMS) بنتی ہے[2]۔ پھر دہشت گردی کرنے والی تنظیموں[3] اور سرکاری محکموں اور افسروں نے طرح طرح سے خوف اور بے بسی کی فضا پیدا کر دی۔ اندھا دھند عربوں کی گرفتاریاں کر کے انہیں حوالات اور جیلوں میں جس طرح کی ذلیل اور شرمناک اذیتوں اور عقوبتوں سے گزارا جاتا ہے ان کا ذکر محمد الغزالی نے اپنی کتاب الاستعمار (ص ۱۸۱ تا ۳۸۳) میں کیا ہے۔ صرف ۱۹۴۷ء میں تشدد اور بہیمیت کے جو کرتوت ہوئے ہیں ان کا ریکارڈ گھناؤنا ہے۔ اور ایک تازہ کتاب میں آگیا ہے[4]۔

مسلمان فلسطینی عربوں کی اس روئیداد الم کا سب سے کرب انگیز ورق وہ ہے جس پر یہود کی طرف سے مسلم معابد و مقابر پر جبرہ دستیوں کا ریکارڈ درج ہے۔ اسی کو میں یہاں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ مگر پہلے ذرا سا ذکر اُن کارروائیوں کا بھی ہو جائے جو عیسائی معابد کے خلاف کی گئیں۔

عیسائی معابد کی توہین | مسلمانوں کے بالمقابل بالعموم عیسائی یہودیوں کا ساتھ دیتے رہے ہیں، (باقی بر صفحہ ۴۴)

---

۱ برطانوی انتدابی حکومت اور فلسطین کمیشن کی رپورٹوں کے ان اعداد و شمار کے لیے حوالہ:- PROFESSOR ISMAIL ZIYID — PALESTINE A STOLEN HERITAGE (1974), P 31.

۲ STATEMENT OF ARAB DELEGATION, P 8, 9.

۳ انگریزوں کی طرف سے قرطاس ابیض (۱۹۳۹ء) شائع ہونے پر برافروختہ صیہونیوں نے ہگانا (HAGANA)، ارگن (IRGUN) اور سٹرن (STERN) نامی دہشت گرد تنظیمیں قائم کیں جو بعد میں نشوونما پا گئیں۔
ZIONIST LEADERS CONSPIRE PUBLISHED BY ARAB DELEGATION, (NEW YARK—1966) P. 29.

۴ COLONEL NANTANEL LORCH (ONE OF THE ZIONIST OFFICER IN THE INVASION) "EDGE OF THE SWORD."

فصل ششم

عالمگیر اُمّتِ مُسلمہ کی تاسیس

(۲)

اُمّتِ مُسلمہ کی شانِ ترکیب اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف اُس اصلی دین کو تازہ کیا جو ابتداء سے چلا آرہا تھا، بلکہ اُس اُمت کو بھی از سرِ نو قائم کیا جو تمام انبیاء علیہم السلام کے زمانے سے اُمت مسلمہ کہلاتی چلی آرہی تھی۔ اِس اُمت میں مختلف قبیلوں اور خاندانوں اور علاقوں سے نکل نکل کر جو لوگ شامل ہوتے چلے گئے، آپ نے اُن سب کو ایک دوسرے کا حامی و مددگار، ایک دوسرے کا بھائی، ایک دوسرے کا ہمدرد و غمگسار بنایا، سب کی جان، مال، آبرو کو برابر کی حرمت دی، سب کے حقوق اور فرائض یکساں ٹھیرائے اور کسی کے لیے کوئی ایسا امتیاز نہ رکھا جو دوسرے کو حاصل نہ ہو۔ یہ عرب کے قبیلہ پرست اور عصبیت زدہ ماحول کے لیے ایک عجیب چیز تھی جسے قبول کرنے کے لیے اُن کا دماغ کسی طرح آمادہ نہ ہوتا تھا۔

ابن زید کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابولہب نے آپ سے ایک روز پوچھا اگر میں تمہارے دین کو مان لوں تو مجھے کیا ملے گا؟ آپ نے فرمایا جو اور سب ایمان لانے والوں کو ملے گا۔ اس نے کہا میرے لیے (یعنی نبی کے چچا کے لیے بھی) کوئی فضیلت نہیں؟ حضورؐ نے فرمایا آپ کیا چاہتے ہیں؟ اس پر وہ بولا تَبًّا لِھٰذَا الدِّیْنِ تَبًّا اَنْ اَکُوْنَ وَھٰٓؤُلَاۗءِ سَوَاۗءً۔ "ناس جائے، اس دین کا ناس جائے، جس میں مَیں اور یہ دوسرے لوگ برابر ہوں" (ابن جریر)

اس تصورِ عصبیت کے برعکس قرآن نے صاف صاف کہا لَنْ تَنْفَعَکُمْ اَرْحَامُکُمْ وَلَآ اَوْلَادُکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ (الممتحنہ) قیامت کے دن نہ تمہاری رشتہ داریاں کام آئیں گی نہ اولاد"۔ یہ خونی رشتے یہیں دھرے کے دھرے رہ جائیں گے اور وہاں اِن کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اصل چیز ایمان ہے جو قیامت میں کام آنے والی ہے اس لیے دنیا میں بھی تمہارے رشتہ و تعلق کی بنیاد اِسی پر قائم ہونی چاہیے۔

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ وَ	تمہارے رفیق تو حقیقت میں صرف اللہ اور
الَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ	اللہ کا رسول اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم
الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ	کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے آگے
رٰكِعُوْنَ (المائدہ-۵۵)	جھکنے والے ہیں۔
اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا	مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں - لہٰذا
بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ (الحجرات-۱۰)	اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو۔

یہ آیت دنیا کے تمام مسلمانوں کی عالمگیر برادری قائم کرتی ہے اور یہ اسی کی برکت ہے کہ کسی دوسرے دین یا مسلک کے پیرووں میں وہ اُخوت نہیں پائی گئی ہے جو مسلمانوں کے درمیان پائی جاتی ہے۔ اس حکم کی اہمیت اور اس کے تقاضوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت ارشادات میں بیان فرمایا ہے جن سے اس کی پوری روح سمجھ میں آسکتی ہے۔

حضرت جریر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے تین باتوں پر بیعت لی تھی - ایک یہ کہ نماز قائم کروں گا، دوسری یہ کہ زکوٰۃ دیتا رہوں گا - تیسری یہ کہ ہر مسلمان کا خیر خواہ رہوں گا" (بخاری، کتاب الایمان)۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اُس سے جنگ کرنا کفر" (بخاری، کتاب الایمان۔ مسند احمد میں اسی مضمون کی روایت حضرت سعید بن مالکؓ نے بھی اپنے والد سے نقل کی ہے)۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی جان، مال اور عزت حرام ہے" (مسلم، کتاب البر والصلۃ - ترمذی ابواب البر والصلۃ)۔

حضرت ابوسعید خدریؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ اُس پر ظلم نہیں کرتا، اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا، اور اس کی تذلیل نہیں کرتا۔ ایک آدمی کے لیے یہی شر بہت ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے" (مسند احمد)

حضرت سہل بن سعد ساعدیؓ آپؐ کا یہ ارشاد روایت کرتے ہیں کہ "گروہ اہلِ ایمان کے ساتھ ایک مومن کا تعلق ویسا ہی ہے جیسا سر کے ساتھ جسم کا تعلق ہوتا ہے۔ وہ اہل ایمان کی ہر تکلیف کو اُسی طرح محسوس

کرتا ہے جس طرح سر جسم کے ہر حصّے کا درد محسوس کرتا ہے"۔ (مُسند احمد)

حضرت نعمانؓ بن بشیر کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَثَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ إِذَا اشْتَكَى مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعَى لَهُ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰى (بخاری ومسلم)

مومنوں کی مثال آپس کے رحم اور محبت اور ہمدردی کے معاملہ میں ایک جسم کی طرح ہے کہ اگر ایک عضو میں کوئی تکلیف ہو تو سارا جسم اس کی خاطر بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا:

اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهٗ بَعْضًا۔

مومن دوسرے مومن کے لیے اُس دیوار کی طرح ہے جس کا ہر حصّہ دوسرے کو مضبوط کرتا ہے۔

(بخاری، مسلم، ترمذی)

حضرت عبداللہؓ بن عمر حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں:

اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهٗ وَلَا يُسْلِمُهٗ وَمَنْ كَانَ فِيْ حَاجَةِ اَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِيْ حَاجَتِهٖ وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِّنْ كُرُبَاتِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے نہ اس کی مدد سے باز رہتا ہے۔ جو شخص اپنے بھائی کی کسی حاجت کو پورا کرنے میں لگا ہوگا اللہ اس کی حاجت کو پورا کرنے میں لگ جائے گا۔ اور جو شخص کسی مسلمان کو کسی مصیبت سے نکالے گا اللہ تعالیٰ اسے روزِ قیامت کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت سے نکال دے گا، اور جو شخص کسی مسلمان کی عیب پوشی کرے گا اللہ قیامت کے روز اس کی عیب پوشی کرے گا۔

(بخاری ومسلم)

حضرت جابرؓ بن عبداللہ اور ابو طلحہؓ بن سہل الانصاری کا بیان ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

مَا مِنِ امْرِئٍ يَخْذُلُ امْرَأً

اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی حمایت ایسے موقع پر نہیں

مُسْلِمًا فِیْ مَوْضِعٍ تُنْتَهَكُ فِيْهِ حُرْمَتُهُ وَيُنْتَقَصُ فِيْهِ مِنْ عِرْضِهِ اِلَّا خَذَلَهُ اللّٰهُ فِیْ مَوْطِنٍ يُحِبُّ فِيْهِ نُصْرَتَهُ، وَمَا مِنِ امْرِئٍ يَنْصُرُ مُسْلِمًا فِیْ مَوْضِعٍ يُنْتَقَصُ فِيْهِ مِنْ عِرْضِهِ وَيُنْتَهَكُ مِنْ حُرْمَتِهِ اِلَّا نَصَرَهُ اللّٰهُ فِیْ مَوْطِنٍ يُحِبُّ فِيْهِ نُصْرَتَهُ۔ (ابوداؤد)

کرتا جہاں اس کی تذلیل کی جا رہی ہو اور اس کی عزت پر حملہ کیا جا رہا ہو تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی حمایت ایسے موقع پر نہیں کرے گا جہاں وہ اللہ کی مدد کا خواہاں ہوگا۔ اور اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی حمایت ایسے موقع پر کرتا ہے جہاں اس کی عزت پر حملہ کیا جا رہا ہو اور اس کی تذلیل و توہین کی جا رہی ہو تو اللہ عزوجل اس کی مدد ایسے موقع پر کرے گا جہاں وہ چاہتا ہے کہ اللہ اس کی مدد کرے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده (بخاری و مسلم)

مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نُفَیع بن الحارث کہتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر یوم النحر کی تقریر میں حضورؐ نے فرمایا:

اَلا فلا ترجعوا بعدی کفارًا یضرب بعضکم رقاب بعضٍ (بخاری و مسلم)

خبردار رہو، میرے بعد کافروں کی طرح نہ ہوجانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے ایک دفعہ فرمایا انصر اخاك ظالماً او مظلوماً "تیرا بھائی ظالم ہو یا مظلوم، اس کی مدد کر"۔ ایک شخص نے عرض کیا اگر وہ مظلوم ہو تو میں اس کی مدد کروں گا، مگر وہ ظالم ہو تو میں اس کی مدد کیسے کروں؟ فرمایا تحجزہ او تمنعہ من الظلم فان ذٰلك نصرہ۔ "اس کو ظلم سے روک دے اور باز رکھ، کیونکہ یہی اس کی مدد ہے" (بخاری)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

المومنون تتکافأ دماءهم وهم يد على من سواهم (مسند ابوداؤد طیالسی، حدیث ۲۲۵۸)

مومنوں کے خون برابر کی قیمت رکھتے ہیں، اور دوسروں کے مقابلے میں وہ سب ایک ہاتھ کی طرح ہیں۔

حضرت انسؓ بن مالک حضورؐ کا یہ قول نقل کرتے ہیں :

امرت ان اقاتل الناس حتی یشہدوا ان لا الٰہ الا اللہ و ان محمداً رسول اللہ ۔ فاذا شہدوا واستقبلوا قبلتنا و اکلوا ذبیحتنا وصلّوا صلوتنا فقد حرّمت علینا دماءھم واموالھم الا بحقّھا ۔ لھم ما للمسلمین وعلیہم ما علیھم (نسائی، کتاب الایمان، مُسند احمد، مرویات انسؓ بن مالک)

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑوں یہاں تک کہ وہ اِس بات کی شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں ، اور محمد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) اللہ کا رسول ہے ۔ پھر جب وہ یہ شہادت دے دیں ، اور ہمارے قبلے کی طرف رُخ کریں اور ہمارا ذبیحہ کھائیں اور ہماری طرح نماز پڑھیں تو اُن کے خون اور ان کے مال ہم پر حرام ہیں سوائے اس کے کہ کوئی حق اُن پر آتا ہو ۔ اُن کے لیے وہی حقوق ہیں جو مسلمانوں کے لیے ہیں اور ان پر وہی فرائض ہیں جو مسلمانوں پر ہیں ۔

ایک دعوت اور تحریک کی علمبردار اُمت مگر یہ اُمت صرف اِس نوعیت کی نہ تھی کہ کچھ لوگ ایمان لا کر بس اپنی جگہ اللہ اللہ کریں ، نیک کام کریں ، اور آپس میں ایک دوسرے کے حامی و مددگار اور ہمدرد و غمخوار ہوں ، بلکہ اِس سے آگے بڑھ کر اِس اُمت کا کام یہ تھا کہ اس کا ہر فرد اسلام کی دعوت کو لوگوں میں پھیلائے ، بھلائی کا حکم دے اور بُرائی سے روکے ۔ یہ پوری اُمت تمام قوموں اور قبیلوں میں سے چھانٹ کر اسی لیے نکالی گئی ہے کہ یہ خلقِ خدا کی اصلاح کرے ، تمام قوموں سے اس کا تعلق حق اور انصاف کا تعلق ہو اور ناحق اور بے انصافی کا تعلق کسی سے نہ ہو ۔ اگر معاملہ صرف پہلی صورت تک محدود ہوتا تو قریش اور مشرکینِ عرب کسی نہ کسی حد تک اسے برداشت کرنے کے لیے تیار ہو سکتے تھے ۔ مگر یہ دوسری صورت ایسی تھی جس میں وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ اُمت بڑھنے اور پھیلنے کا صرف رُجحان ہی نہیں رکھتی بلکہ فرداً فرداً اِس کا ہر شخص ، اور اجتماعی طور پر یہ پوری جماعت اپنی تحریک کو پھیلانے میں سرگرم ہے ۔ اس سے ان کے اندیشے حد برداشت سے بڑھ گئے کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ روز انہ ٹوٹ ٹوٹ کر اُن کے آدمی اِس نئی جماعت میں شامل ہوتے جا رہے ہیں ۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ

اور اُس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا

اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (حٰم السجدہ - ۳۳) کہ میں مسلمان ہوں۔

اس سے پہلے کی آیت میں مسلمانوں کو بتایا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی پر ثابت قدم ہوجانا اور اِس راستے کو اختیار کرلینے کے بعد پھر اُس سے منحرف نہ ہونا بجائے خود وہ بنیادی نیکی ہے جو آدمی کو فرشتوں کا دوست اور جنت کا مستحق بناتی ہے۔ اُس کے بعد اِس آیت میں اُن کو بتایا گیا ہے کہ آگے کا درجہ، جس سے زیادہ بلند کوئی درجہ انسان کے لیے نہیں ہے، یہ ہے کہ تم خود نیک عمل کرو، اور دوسروں کو اللہ کی بندگی کی طرف بلاؤ، اور شدید مخالفت کے ماحول میں بھی، جہاں اسلام کا اعلان و اظہار کرنا اپنے اوپر مصیبتوں کو دعوت دینا ہے، ڈٹ کر کہو کہ میں مسلمان ہوں۔ اِس ارشاد کی پوری اہمیت سمجھنے کے لیے اُس ماحول کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے جس میں یہ بات فرمائی گئی تھی۔ اُس وقت حالت یہ تھی کہ جو شخص بھی مسلمان ہونے کا اظہار کرتا تھا اُسے یکایک یہ محسوس ہوتا تھا کہ گویا اُس نے درندوں کے جنگل میں قدم رکھ دیا ہے جہاں ہر ایک اُسے پھاڑ کھانے کو دوڑ رہا ہے۔ اور اِس سے آگے بڑھ کر جس نے اسلام کی تبلیغ کے لیے زبان کھولی اس نے تو گویا درندوں کو پکار دیا کہ آؤ اور مجھے بھنبھوڑ ڈالو۔ ان حالات میں فرمایا گیا ہے کہ کسی شخص کا اللہ کو اپنا رب مان کر سیدھی راہ اختیار کرلینا اور اُس سے نہ ہٹنا بلاشبہ اپنی جگہ بڑی اور بنیادی نیکی ہے، لیکن کمال درجے کی نیکی یہ ہے کہ آدمی اُٹھ کر کہے کہ میں مسلمان ہوں، اور نتائج سے بے پروا ہو کر اللہ کی بندگی کی طرف خلقِ خدا کو دعوت دے، اور اپنے اس کام کو کرتے ہوئے اپنا عمل اتنا پاکیزہ رکھے کہ کسی کو اسلام اور اس کے علمبرداروں پر حرف رکھنے کی گنجائش نہ ملے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً	اور اِسی طرح ہم نے تم کو ایک اُمتِ
وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى	وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں
النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ	پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ۔
شَهِيْدًا (البقرہ - ۱۴۳)	

یہ دراصل اُمتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت کا اعلان ہے۔ "اسی طرح" کا اشارہ اللہ کی اُس رہنمائی کی طرف بھی ہے جس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی قبول کرنے والوں کو سیدھی راہ معلوم ہوئی اور وہ ترقی کرتے کرتے اِس مرتبے پر پہنچے کہ "امتِ وسط" قرار دیے گئے، اور تحویل قبلہ کی طرف بھی جسے نادان محض ایک سمت سے دوسری سمت کی طرف پھرنا سمجھ رہے تھے، حالانکہ دراصل بیت المقدس سے کعبے کی طرف سمتِ قبلہ کا پھرنا یہ معنی رکھتا تھا کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو دنیا کی پیشوائی کے منصب سے باضابطہ

معزول کیا اور امتِ محمدیہ کو اس پر فائز کر دیا۔

"امتِ وَسَط" کا لفظ اس قدر وسیع معنویت اپنے اندر رکھتا ہے کہ کسی دوسرے لفظ سے اس کے ترجمے کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے مراد ایک ایسا اعلیٰ اور اشرف گروہ ہے، جو عدل و انصاف اور توسّط کی روش پر قائم ہو، جو دنیا کی قوموں کے درمیان صدر کی حیثیت رکھتا ہو، جس کا تعلق سب کے ساتھ یکساں حق اور راستی کا تعلق ہو اور ناحق، ناروا تعلق کسی سے نہ ہو۔

پھر یہ جو فرمایا کہ تمھیں "امتِ وَسَط" اس لیے بنایا گیا ہے کہ "تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ"، تو اس سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں جب پوری نوعِ انسانی کا اکٹھا حساب لیا جائے گا، اس وقت رسول، اللہ تعالیٰ کے ذمہ دار نمائندے کی حیثیت سے تم پر گواہی دے گا کہ فکرِ صحیح اور عملِ صالح اور نظامِ عدل کی جو تعلیم اللہ نے اسے دی تھی، وہ اس نے تم کو بے کم و کاست پوری کی پوری پہنچا دی اور عملاً اس کے مطابق کام کر کے دکھا دیا۔ اس کے بعد رسول کے قائم مقام ہونے کی حیثیت سے تم کو عام انسانوں پر گواہ کی حیثیت سے اٹھنا ہوگا اور یہ شہادت دینی ہوگی کہ رسول نے جو کچھ تمھیں پہنچایا تھا وہ تم نے انھیں پہنچانے میں، اور جو کچھ رسول نے تمھیں دکھایا تھا وہ تم نے انھیں دکھانے میں اپنی حد تک کوئی کوتاہی نہیں کی۔

اس طرح کسی شخص یا گروہ کا اس دنیا میں خدا کی طرف سے گواہی کے منصب پر مامور ہونا ہی درحقیقت اس کا امامت اور پیشوائی کے مقام پر سرفراز کیا جانا ہے۔ اس میں جہاں فضیلت اور سرفرازی ہے وہیں ذمہ داری کا بہت بڑا بار بھی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس امت کے لیے خدا ترسی، راست روی، عدالت اور حق پرستی کی زندہ شہادت بنے، اسی طرح اس امت کو بھی تمام دنیا کے لیے زندہ شہادت بننا چاہیے، حتیٰ کہ اس کے قول اور عمل اور برتاؤ ہر چیز کو دیکھ کر دنیا کو معلوم ہو کہ خدا ترسی اس کا نام ہے، راست روی یہ ہے، عدالت اس کو کہتے ہیں اور حق پرستی ایسی ہوتی ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ	تم دنیا میں وہ بہترین امت ہو جسے (انسانوں
لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ	کی ہدایت و اصلاح کے لیے) میدان میں لایا گیا ہے۔
وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ	تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ

بِاللّٰهِ ؕ (آل عمران - ۱۱۰) پر ایمان رکھتے ہو۔

اِس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین کو بتایا جا رہا ہے کہ دنیا کی امامت و رہنمائی کے جس منصب سے بنی اسرائیل اپنی نا اہلی کے باعث معزول کیے جا چکے ہیں اس پر اب تم مامور کیے گئے ہو۔ اس لیے کہ اخلاق و اعمال کے لحاظ سے اب تم دنیا میں سب سے بہتر انسانی گروہ بن گئے ہو اور تم میں وہ صفات پیدا ہو گئی ہیں جو امامتِ عادلہ کے لیے ضروری ہیں، یعنی نیکی کو قائم کرنے اور بدی کو مٹانے کا جذبہ و عمل اور اللہ وحدہٗ لاشریک کو اعتقاداً و عملاً اپنا الٰہ اور رب تسلیم کرنا۔ لہٰذا اب امامت عالم کا یہ کام تمہارے سپرد کیا گیا ہے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ	مومن مرد اور مومن عورتیں، سب ایک
اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ	دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ	اور بُرائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے
الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ	ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے
يُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ	رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔

(التوبہ - ۷۱)

یعنی مومن مرد و زن ایک ایسا گروہ بن گئے ہیں جس کے افراد میں یہ خصوصیت مشترک ہے کہ نیکی سے وہ اتنی دلچسپی رکھتے ہیں کہ دنیا کو اس کا حکم دیتے ہیں، بدی سے وہ اتنی نفرت کرتے ہیں کہ دنیا کو اس سے روکتے ہیں۔ خدا کی یاد اُن کے لیے غذا کی طرح زندگی کی ناگزیر ضروریات میں شامل ہے، راہِ خدا میں مال خرچ کرنے کے لیے ان کے دل اور ہاتھ کھلے ہوئے ہیں، اور خدا اور رسول کی اطاعت ان کی زندگی کا وتیرہ ہے۔ اس مشترک اخلاقی مزاج اور طرزِ زندگی نے انہیں آپس میں ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہے۔

فدا کاری کا جذبہ اس امت کے لوگوں میں یہ جذبہ بھی پیدا کیا گیا کہ وہ اپنے دین کو ہر چیز پر مقدم رکھیں، ہر چیز کو اس پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائیں، مگر کسی چیز پر اُسے قربان کرنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ اگر اپنے وطن، خاندان، گھر بار میں رہتے ہوئے خدا کی بندگی کرنا ممکن ہو تو ٹھیک، لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو ایمان کا امتحان اسی چیز میں ہے کہ آیا وہ گھر بار، بال بچوں، خاندان اور وطن کی محبت میں خدا کی بندگی کو چھوڑتے ہیں یا خدا کی بندگی کے لیے ان سب کو چھوڑ کر ہجرت اور جلاوطنی کے خطرات مول لیتے ہیں؟

وَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا فِی اللّٰہِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّھُمْ فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً ؕ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَۃِ اَکْبَرُ ۘ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ۔ (النحل - ۴۱)	جو لوگ ظلم سہنے کے بعد اللہ کی خاطر ہجرت کر گئے ہیں ان کو ہم دنیا ہی میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے ۔
یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَۃٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ ۔ کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَۃُ الْمَوْتِ ۟ ثُمَّ اِلَیْنَا تُرْجَعُوْنَ ۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّھُمْ مِّنَ الْجَنَّۃِ غُرَفًا تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ؕ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ۔ وَکَاَیِّنْ مِّنْ دَآبَّۃٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَھَا ۔ اَللّٰہُ یَرْزُقُھَا وَاِیَّاکُمْ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۔ (العنکبوت ۵۶ تا ۶۰)	اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو، میری زمین وسیع ہے، پس تم میری ہی بندگی بجا لاؤ ۔ ہر متنفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے، پھر تم سب ہماری طرف ہی پلٹا کر لائے جاؤ گے ۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں ان کو ہم جنت کی بلند و بالا عمارتوں میں رکھیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے کیا ہی عمدہ اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے ـــــ اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے صبر کیا ہے اور جو اپنے رب پہ بھروسہ کرتے ہیں ۔ اور کتنے ہی جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے ۔ اللہ ان کو رزق دیتا ہے اور تمہارا رازق بھی وہی ہے ۔ وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے ۔

سورۂ عنکبوت کی اِن آیات کا ایک ایک لفظ غور طلب ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا جذبہ تھا جو اُس وقت اُمت مسلمہ میں پھونکا گیا تھا ۔

پہلی آیت میں اشارہ ہے ہجرت کی طرف ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر مکے میں خدا کی بندگی کرنی مشکل ہو رہی ہے تو ملک چھوڑ کر نکل جاؤ ۔ خدا کی زمین تنگ نہیں ہے ۔ جہاں بھی تم خدا کے بندے بن کر رہ سکتے ہو وہاں چلے جاؤ ۔ تم کو قوم و وطن کی نہیں بلکہ اپنے خدا کی بندگی کرنی چاہیے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل چیز قوم، وطن اور ملک نہیں ہے بلکہ اللہ کی بندگی ہے ۔ اگر کسی وقت قوم و وطن اور ملک کی محبت کے تقاضے اللہ کی بندگی

کے تقاضوں سے ٹکرا جائیں تو وہی وقت مومن کے ایمان کی آزمائش کا ہوتا ہے۔ جو سچا مومن ہے وہ اللہ کی بندگی کرے گا اور قوم، وطن اور ملک کو لات مار دے گا۔ جو جھوٹا مدعی ایمان ہے وہ ایمان کو چھوڑ دے گا اور اپنی قوم اور اپنے ملک و وطن سے چمٹا رہے گا۔ یہ آیت اس باب میں بالکل صریح ہے کہ ایک سچا خدا پرست انسان محبِ قوم و وطن تو ہو سکتا ہے مگر قوم پرست اور وطن پرست نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے خدا کی بندگی ہر چیز سے عزیز تر ہے جس پر دنیا کی ہر چیز کو وہ قربان کر دے گا مگر اسے دنیا کی کسی چیز پر بھی قربان نہ کرے گا۔

دوسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ جان کی فکر نہ کرو۔ یہ تو کبھی نہ کبھی جانی ہی ہے۔ ہمیشہ رہنے کے لیے تو کوئی بھی دنیا میں نہیں آیا ہے۔ لہٰذا تمہارے لیے فکر کے لائق مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اس دنیا میں جان کیسے بچائی جائے، بلکہ اصل لائق فکر مسئلہ یہ ہے کہ ایمان کیسے بچایا جائے اور خدا پرستی کے تقاضے کس طرح پورے کیے جائیں۔ آخر کار تمہیں پلٹ کر ہماری طرف ہی آنا ہے۔ اگر دنیا میں جان بچانے کے لیے ایمان کھو کر آئے تو اس کا نتیجہ کچھ اور ہو گا اور ایمان بچانے کے لیے جان کھو آئے تو اس کا انجام کچھ دوسرا ہو گا۔ پس فکر جو کچھ بھی کرنی ہے اِس بات کی کرو کہ ہماری طرف جب پلٹو گے تو کیا لے کر پلٹو گے؟ جان پر قربان کیا ہوا ایمان؟ یا ایمان پر قربان کی ہوئی جان؟

تیسری آیت میں بتایا گیا کہ اگر ایمان اور نیکی کے راستے پر چل کر بالفرض تم دنیا کی ساری نعمتوں سے محروم بھی رہ گئے اور دنیوی نقطۂ نظر سے سراسر ناکام ہی مرے تو یقین رکھو کہ اس کی تلافی بہر حال ہو گی اور نری تلافی ہی نہ ہو گی بلکہ بہترین اجر بھی نصیب ہو گا۔

چوتھی آیت میں فرمایا گیا کہ آخرت کا یہ بہترین اجر اُن لوگوں کے لیے ہے جو ہر طرح کی مشکلات اور مصائب اور نقصانات اور اذیتوں کے مقابلے میں ایمان پر قائم رہے۔ جنہوں نے ایمان لانے کے خطرات کو اپنی جان پر جھیلا اور منہ نہیں موڑا۔ ترکِ ایمان کے فائدوں اور منفعتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان کی طرف ذرہ برابر التفات نہ کیا۔ کفّار و فسّاق کو اپنے سامنے پھلتے پھولتے دیکھا اور ان کی دولت و حشمت پر ایک نگاہِ غلط انداز بھی نہ ڈالی۔ جنہوں نے بھروسا اپنی جائدادوں اور اپنے کاروبار اور اپنے کنبے قبیلے پر نہیں بلکہ اپنے رب پر کیا۔ جو اسبابِ دنیوی سے قطع نظر کر کے محض اپنے رب کے بھروسے پر ایمان کی خاطر ہر خطرہ سہنے اور ہر طاقت سے ٹکرا جانے کے لیے تیار ہو گئے اور وقت آیا تو گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے

ہوئے جنہوں نے اپنے رب پر یہ اعتماد کیا کہ ایمان اور نیکی پر قائم رہنے کا اجر اس کے ہاں کبھی ضائع نہ ہوگا اور یقین رکھا کہ وہ اپنے مومن و صالح بندوں کی اس دنیا میں بھی دستگیری فرمائے گا اور آخرت میں بھی ان کے عمل کا بہترین بدلہ دے گا۔

آخری آیت میں فرمایا ہجرت کرتے ہوئے تمہیں فکرِ جان کی طرح فکرِ روزگار سے بھی پریشان نہ ہونا چاہیے۔ آخر یہ بے شمار چرند و پرند اور آبی حیوانات جو تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوا اور خشکی اور پانی میں پھر رہے ہیں، ان میں سے کون اپنا رزق اُٹھائے پھرتا ہے؟ اللہ ہی تو ان سب کو پال رہا ہے۔ جہاں جاتے ہیں اللہ کے فضل سے ان کو کسی نہ کسی طرح رزق مل ہی جاتا ہے۔ لہٰذا تم یہ سوچ سوچ کر ہمت نہ ہارو کہ اگر ایمان کی خاطر گھر بار چھوڑ کر نکل گئے تو کھائیں گے کہاں سے۔ اللہ جہاں سے اپنی بے شمار مخلوق کو رزق دے رہا ہے انہیں بھی دے گا۔ (باقی)

مصری عدلیہ کا ایک اہم فیصلہ

(۲)

جناب خلیل حامدی صاحب

چوتھا گواہ: ایک قدیم دوست چوتھے گواہ عبد المنعم خلیفہ محمد نے گواہی دیتے ہوئے کہا:

"۳۰ اگست ۱۹۶۵ء کو ملٹری پولیس کے سپاہی میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر مجھے فوجی جیل میں لے گئے۔ میں راستے میں چیخ پکار کرتا اور گریہ زاری کرتا رہا۔ جب آنکھوں سے پٹی کھولی گئی تو میں نے کئی انسان اُلٹے لٹکے ہوئے دیکھے جن پر چند افراد مسلط تھے اور انہیں تازیانے مار رہے تھے۔ جب تفتیش شروع ہوئی تو مجھ سے مدّعی (علی جریشہ) کے بارے میں پوچھا گیا۔ میں نے تسلیم کیا کہ میں اُسے جانتا ہوں۔ پھر حسن کفافی نے مدعی کو میرے سامنے بلوایا تاکہ میں دیکھ لوں کہ اُس کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہے اور مجھے معلوم ہو جائے کہ اگر میں بھی ان کی ہاں میں ہاں نہ ملاؤں تو میری بھی وہ تکا بوٹی کر دیں گے۔ چنانچہ جب مجھے مدّعی کے سامنے لایا گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ مسکین پالتی مار کر بیٹھا ہوا ہے۔ حسن کفافی نے مدّعی کو مخاطب ہو کر کہا تمہاری .... (ایک بہت نازیبا گالی جسے مترجم کا قلم بیان کرنے کے لیے تیار نہیں ہے)۔ اور پھر حکم دیا "جج صاحب! ذرا کتے کی طرح بھونکیے!" چنانچہ مدّعی نے بحالت اضطرار بھونکنا شروع کر دیا۔ مدّعی کا پورا جسم زخموں سے چُور چُور تھا۔ ہاتھ بھی زخمی تھے اور پاؤں بھی۔ پھر حسن کفافی نے مجھ سے کہا کہ "بتاؤ علی جریشہ نے تم سے کیا کہا تھا"۔ میں نے ایسی کسی گفتگو کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ چنانچہ مجھے قصابوں کے طریقے کے مطابق اُلٹا لٹکا دیا گیا اور سوڈانی طرز کے چرمی تازیانے مجھ پر برسنے لگے۔ یہ تازیانے خاص طور پر سوڈان سے منگوائے گئے تھے۔ پھر یہ لوگ مجھے اور مدّعی (علی جریشہ) کو شمس بدران کے دفتر میں لے گئے۔ شمس بدران نے ہمیں کہا کہ "صدر جمہوریہ (جمال عبد الناصر) کی طرف سے احکام صادر ہوئے ہیں کہ علی جریشہ کو خوب عذاب

دو۔ یہاں تک کہ وہ مر جائے"۔ پھر مجھے اور علی جریشہ کو تحقیقات کے لیے لے جایا گیا۔ جب علی جریشہ نے تحقیقات کے دوران ایسے جوابات دیے جو حسن کفافی اور حسن خلیل کو پسند نہ آئے تو دونوں نے کہا: "جج ... کے بچے کو اُلٹا لٹکا دو جو ہمیں یہ جواب دیتا ہے کہ ہماری کوئی قانونی اتھارٹی نہیں ہے اور ہم فیصلے صادر کرنے کے اختیارات نہیں رکھتے"۔ چنانچہ علی جریشہ کو فوراً اُلٹا لٹکا دیا گیا اور تاک تاک کر اُس کے پُرانے زخموں پہ تازیانے مارے گئے۔ وہاں چند خواتین بھی تھیں جنہیں سپاہیوں نے سر کے بل لٹکا رکھا تھا اور کوڑوں سے انہیں مار رہے تھے۔ انہوں نے علی جریشہ کو دھمکی دی کہ "وہ اُس کی بیوی کو بھی یہاں لائیں گے اور اُس کا بھُرکس نکالیں گے اور اُس کی عصمت دری کریں گے۔ دوسروں کے ساتھ وہ ایسا کر چکے ہیں۔ ان کی بیویوں، بہنوں اور دیگر رشتہ دار عورتوں کو یہاں لا کر اُن کی ایسی تیسی کر چکے ہیں"۔ مولوی محمد عبدالمقصود کی مثال انھوں نے خاص طور پر بیان کی جس کی بیوی اور لڑکیوں اور اُن کے شوہروں اور لڑکوں اور اُن کی بیویوں کو فوجی جیل میں لاکر تعذیب اور بے حرمتی کا نشانہ بنایا گیا۔ اسی طرح مامون الھضیبی (الاخوان المسلمون کے مرشد عام جناب حسن الھضیبی مرحوم کے صاحبزادے) کی والدہ اور بہنوں اور بیٹیوں اور ایک بیٹی کے خاوند کو بھی جیل میں لایا گیا اور ان کے ساتھ ظلم و تشدد اور بدسلوکی کی انتہا کی گئی۔

پانچواں گواہ: مدعی کا بھائی پانچویں گواہ سید احمد جریشہ نے بیان دیتے ہوئے کہا:

"میرے بھائی علی جریشہ کی گرفتاری کے دوران میرے پاس ملٹری انٹیلی جنس کے دو افراد آئے اور مجھ سے پوچھا کہ علی جریشہ کی بیوی کا پتہ کیا ہے۔ میں نے انہیں پتہ بتا دیا۔ چنانچہ وہ دونوں کئی بار وہاں گئے۔ لیکن انہیں علی جریشہ کی بیوی نہ مل سکی۔ چھ ماہ بعد مجھے معلوم ہوا کہ میرا بھائی فوجی جیل میں مقید ہے۔ بڑی کوشش کے بعد مجھے اپنے بھائی کو جیل میں کپڑے پہنچانے کی اجازت ملی۔ جب میں نے جیل کے داروغہ کو بھائی کے لیے نئے کپڑے دیے تو مجھے ان کے پُرانے کپڑے واپس کیے گئے۔ یہ کپڑے خون سے بُری طرح آلودہ تھے۔ اور خون اور پیپ اُن سے ٹپک رہی تھی۔ بعد میں ملٹری انٹیلی جنس کے لوگ میرے گھر میں گھس آئے اور کئی روز تک انہوں نے میرے ہاں ڈیرے ڈالے رکھے۔ یہ منظر میری بیوی کے لیے شدید صدمے کا موجب بنا اور وہ ایسی بیمار ہوئی کہ آج تک اس کی بیماری کا سلسلہ جاری ہے۔ میں نے فوجی جیل سے گہرا تعلق رکھنے والے لوگوں سے سُنا ہے کہ اس جیل میں انسانوں کو نہایت ہولناک عذاب دیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ لوگوں کو لوہے کے گرم سلاخوں سے داغا جاتا ہے۔ ایک قیدی کے رشتہ دار نے مجھے بتایا کہ ایک مرتبہ صفوت الروبی

جیل سے باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں چمڑے کا تازیانہ تھا جو خون سے لت پت تھا اور وہ یہ دھمکی دے رہا تھا کہ جس طرح وہ قیدیوں کی خبر لیتا ہے اُن کی ملاقات کے لیے آنے والوں کی بھی ویسی ہی خبر لے سکتا ہے۔"

چھٹا گواہ : مدعی کا برادر نسبتی چھٹے گواہ محمد جلال عبد المنعم نے گواہی دی کہ:

"وہ مدعی (علی جریشہ) کا برادر نسبتی ہے۔ ملٹری انٹیلی جنس کے لوگ مدعی کی بیوی کی تلاش میں تھے۔ مجھ سے انہوں نے بڑی پوچھ گچھ کی۔ مگر میں نے انہیں بتایا کہ مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ اب وہ کہاں ہے۔ البتہ میں مدعی کے کپڑے جو جیل سے آیا کرتے تھے وصول کیا کرتا تھا اور ان کے بجائے صاف کپڑے دیا کرتا تھا۔ جیل سے جو کپڑے آیا کرتے تھے وہ خون اور پیپ سے لت پت ہوا کرتے تھے۔"

عدالت کا فیصلہ یہ ہیں گواہوں کے بیانات۔ مدعا علیہ (موجودہ وزیر جنگ) نے کوئی گواہ پیش نہیں کیا ہے البتہ اس نے شمس بدران (سابق وزیر جنگ جس کے دور میں علی جریشہ کو گرفتار کیا گیا تھا) حمزہ بسیونی (کمانڈر فوجی جیل) کے ورثا، سعد زغلول، حسن خلیل، حسن کفافی اور محمد صفوت الردبی کے خلاف ضمنی استغاثہ کیا ہے۔ اس بنا پر کہ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے مدعی پر مظالم کیے ہیں، اور مدعی نے اُن سے اپنے نقصانات کا معاوضہ طلب کیا ہے۔ مصری قانون تعزیرات کی دفعہ ۱۷۵ میں یہ طے کیا گیا ہے کہ افسر کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر ماتحت نے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہے اور اس سے کسی شہری کو مالی یا بدنی نقصان پہنچا ہے تو وہ ماتحت کی طرف رجوع کرے، ویسے ہی جیسے ضامن اُس مقروض کی طرف رجوع کرتا ہے جس کی اُس نے ضمانت دی ہو۔ اور اُصول یہ ہے کہ ضامن شخص ضمانت یافتہ شخص کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اُس کی ذمہ داری میں شریک نہیں ہوتا۔ اسی اُصول کے تحت مدعا علیہ (موجودہ وزیر جنگ) کا یہ مطالبہ ہے کہ مذکورہ بالا افراد کے خلاف یہ حکم صادر کیا جائے کہ وہ مل جل کر اپنی ذاتی املاک میں سے مدعی کے اُس نقصان کی تلافی کریں جس کی تلافی کا حکم عدالت سے جاری ہو۔ نیز مقدمہ کے جملہ مصارف اور وکیل کا معاوضہ بھی اُن سے دلوایا جائے۔

مدعی نے ایک یادداشت بھی پیش کی جس میں گواہوں کے بیانات کی طرف عدالت کی توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا ہے کہ یہ گواہ صادق و عادل ہیں اور حالات کے عینی شاہد ہیں۔ جو کچھ انہوں نے دیکھا ہے اُسے ہُوبہو بیان کر دیا ہے۔ اور بنیادی مقدمے کا مدعا علیہ دفعہ ۱۷۴ کے بموجب اُس نقصان کا ذمہ دار ہے جو اُس کے ماتحت افراد کی طرف سے غیر قانونی طور پر مدعی کو پہنچایا گیا ہے۔ نیز دستور کی دفعہ ۵۷ اس بات کی تائید کرتی ہے کہ جس شخص کی شخصی آزادی پر حملہ کیا گیا ہو اُسے ریاست عادلانہ معاوضہ ادا کرنے کی ذمہ دار ہے۔

صفائی کا موقف بنیادی مقدمے کے مدعا علیہ موجودہ وزیر جنگ نے بھی ایک یادداشت پیش کی ہے۔ اُس میں کہا گیا ہے کہ مدعی کے گواہوں میں سے کسی گواہ نے بھی مدعی کو عذاب دیے جانے کا چشم دید واقعہ بیان نہیں کیا۔ رہی یہ بات کہ مدعی گھٹنوں اور کہنیوں کے بل رینگتا ہوا دیکھا گیا تو ہوسکتا ہے کہ مدعی نے بیماری کی وجہ سے یہ کیفیت اختیار کی ہو۔ لہٰذا مدعی تعذیب کا ثبوت پیش کرنے سے قاصر رہا ہے اور یہ احتمال ہے کہ یہ مقدمہ ایسی غیر صحت مندانہ بنیادوں پر دائر کیا گیا ہے جو مسترد کر دینے کے قابل ہیں۔ مدعا علیہ نے لبطور احتیاط مدعی کو معاوضہ پیش کر دینے کے پہلو پر بھی بحث کی ہے اور کہا ہے کہ چونکہ واقعہ تعذیب ثابت نہیں ہوسکا ہے لہٰذا مدعی کو کوئی مالی نقصان نہیں پہنچا۔ اگر اسے کوئی مالی نقصان پہنچتا تو یقیناً وہ بروقت ذمہ دار لوگوں کو اطلاع کر دیتا۔ تحقیقات سے متعلق جملہ کاغذات ایسی کسی اطلاع سے قطعاً خالی ہیں۔ رہا اخلاقی نقصان جس کا مدعی نے ذکر کیا ہے اور جس کی بنیاد مدعی نے یہ قائم کی ہے کہ قانونی کارروائی کیے بغیر اُسے گرفتار کر لیا گیا تھا تو سیکورٹی کورٹ آف اسٹیٹ میں اُس کا مقدمہ درج کیا گیا تھا۔ اور سیکورٹی کورٹ آف اسٹیٹ نے اُسے سزا سنائی تھی۔ لہٰذا اب تنفیذ حکم پر معاوضے کا مطالبہ کرنا جائز نہیں ہے۔ مدعا علیہ نے یہ تمام بحث کرنے کے بعد یہ مطالبہ کیا ہے کہ مدعی کے قائم کردہ مقدمہ کو داخل دفتر کر دیا جائے۔ رہا ضمنی مقدمہ تو جن لوگوں نے مدعی کو نقصان پہنچایا ہے ——— اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ اُسے نقصان پہنچایا گیا ہے ——— تو گو وہ اُس کے ماتحت ملازمین ہیں لیکن اس جرم کے وہ خود ذمہ دار ہیں اور مدعی قانون کی دفعہ ۱۷۵ کے تحت اُن کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔ مدعا علیہ نے یہ بھی مطالبہ کیا ہے کہ عدالت ضمنی مقدمہ کے مدعا علیہم کے خلاف مناسب فیصلہ صادر کرے اور مقدمہ کے مصارف اور وکیل کا معاوضہ اُن سے وصول کیا جائے۔

عدالت کا تبصرہ جہاں تک گواہوں کے بیانات کا تعلق ہے، ایک طرف تو اُن بیانات کی تردید کرنے والی کوئی چیز سامنے نہیں آئی، اور دوسری طرف عدالت یہ محسوس کرتی ہے کہ گواہ بالکل سچے ہیں کیونکہ ان کی گواہی کی بنیاد وہ حالات ہیں جن کا انہوں نے بچشم سر مشاہدہ کیا ہے اور جن میں وہ خود گھرے رہے ہیں۔ ان کی گواہی دل کی گہرائیوں سے اُچھل اُچھل کر باہر آ رہی تھی۔ ان کی زبان میں فطری روانی تھی جس میں کوئی تصنع نہیں تھا، نہ کوئی دراندازی تھی، نہ تضاد اور اختلاف تھا جو شک و شبہ کی گنجائش پیدا کر دیتا۔ پہلے گواہ ڈاکٹر کمال رمزی استینو کا بیان عینی گواہوں کی تصدیق کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر کمال رمزی اُس دور کا ایک اہم ستون تھا۔ وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ وہ دور ظلم و جور کا دور تھا، دار و گیر کا دور تھا، فوجی جیل میں اور اسکندریہ کے

مصطفیٰ کامل فوجی کیمپ میں تعذیب و توہین اُس دور میں عام تھی۔ اس دَور میں بے گناہ انسانوں کے خلاف جھوٹی تہمتیں گھڑی گئیں۔ وہ دورِ استبداد تھا جس میں حکمران طاقت اپنی خواہش کے تحت جس انسان کے خلاف چاہتی جائز و ناجائز ہر ہتھکنڈہ استعمال کرتی تھی۔ اس دور کا اصل دارو مدار عسکری پولیس اور فوج کے محکمۂ جاسوسی پر تھا۔ ان اداروں کا خوف ہر انسان پر چھایا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ وزراء اور وزیر اعظم کے نائبین تک ان سے لرزتے تھے۔ مدعی بھی ان کی چیرہ دستی کا اس لیے نشانہ بن گیا کہ وہ دسیسہ کاری اور جعل سازی میں ان کا ساتھ نہ دے سکا۔ چنانچہ مدعی کے گواہوں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ عدالت کو دعوے کی صحت کا یقین دلانے کے لیے کافی ہے۔ عدالت کا ضمیر و وجدان صحتِ دعویٰ پر مطمئن ہے۔ اور مدعی نے اپنی درخواست میں جس جسمانی تعذیب اور مالی نقصان کا ذکر کیا ہے اُس کا ثبوت واضح طور پر سامنے آگیا ہے۔ ضمنی دعوے میں جو دو یادداشتیں (ایک مدعا علیہ وزیر جنگ کی طرف سے اور دوسری حسن کفافی کی طرف سے) پیش کی گئی ہیں اور ان میں گواہوں پر جو تنقید کی گئی ہے وہ ایک فریب اور حیلہ جوئی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ نرم سے نرم الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ مدعی اور اس کے گواہوں کی صداقت میں شک پیدا کرنے کی ایک ناکام اور نہایت بھونڈی کوشش ہے۔

ضمنی دعوے کے مدعا علیہ نمبر ایک شمس بدران (سابق وزیر جنگ) کا جرم گواہ عبدالمنعم کی شہادت سے ثابت ہو گیا ہے۔ گواہ مذکورہ کے بیان کے مطابق جب اُسے (یعنی خود گواہ کو) اور مدعی علی جریشہ کو فوجی جیل کے اندر ملزم شمس بدران کے دفتر میں پیش کیا گیا تو اس نے کہا کہ اُسے صدر جمہوریہ کی طرف سے یہ ہدایات ملی ہیں کہ علی جریشہ کو اتنا عذاب دیا جائے کہ وہ مر جائے۔ اسی طرح گواہ ابراہیم منیر نے یہ اقرار کیا ہے کہ علی جریشہ کے ساتھ اُسے بھی نشانۂ تعذیب بنایا گیا۔ مدعا علیہ حمزہ بسیونی (کمانڈر فوجی جیل) کا جُرم بھی ابراہیم منیر کی گواہی سے ثابت ہو جاتا ہے مدعا علیہ حسن خلیل کا جُرم بھی ابراہیم منیر کی گواہی سے عیاں ہو جاتا ہے۔ مدعا علیہ حسن کفافی کا جرم گواہ سید احمد اور گواہ محمد عبدالمنعم کی گواہوں سے مُبرہن ہے۔ مدعا علیہ صفوت الروبی کا جرم گواہ ابراہیم منیر کے بیان سے ثابت ہو جاتا ہے۔ تمام گواہ اس بات پر متفق ہیں کہ ضمنی دعوے کے تمام مدعا علیہم فوجی جیل کی حدود میں ان جرائم کا ارتکاب کرتے رہے ہیں۔ حالانکہ فوجی جیل کے اندر صرف قیدی کو ہونا چاہیے یا جیلر کو۔ تمام قیدی اس بات پر بھی یک زبان ہیں کہ جو شخص بھی فوجی جیل میں لایا گیا ہے اُسے عذاب دیا گیا ہے اور مدعا علیہم میں سے ہر شخص براہ راست

مدّعی کو عذاب دیتا رہا ہے یا عذاب دینے میں شریک رہا ہے۔

کمال رمزی استینو سابق نائب وزیر اعظم نے صدر جمال عبد الناصر کو مدّعی علی جریشہ کی گرفتاری کی اطلاع کر دی تھی۔ گواہ عبد المنعم نے کہا ہے کہ مدّعا علیہ شمس بدران نے مدّعی کو کہا تھا کہ اُس کے پاس صدر جمہوریہ کی طرف سے احکام ہیں کہ مدّعی کو عذاب دے دے کر مار ا جائے۔ مدّعا علیہ حسن کفافی اور مدّعا علیہ سعد زغلول نے یہ تأثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اُنہیں جو احکام دیے جاتے تھے وہ اُن پر کوئی چون وچرا نہیں کر سکتے تھے یہ سب دلیلیں کسی زیادتی کرنے والے کو معاف نہیں کر سکتیں اور نہ اُسے ذمہ داری سے بری کر سکتی ہیں۔ مصری قانون کی دفعہ ۱۶۷ یہ واضح کرتی ہے کہ:

"سرکاری ملازم اگر افسر کے حکم کا نفاذ کرتے وقت کسی دوسرے کو نقصان پہنچاتا ہے تو وہ اپنی کارروائی کا ذمہ دار نہیں ہوگا، بشرطیکہ اُس حکم کی اطاعت اُس کے لیے فرض ہو، یا وہ یہ سمجھتا ہو کہ اُس حکم کی اطاعت اُس پر فرض ہے اور وہ یہ ثابت کر دے کہ وہ اپنی اس کارروائی کو جائز فعل سمجھتا تھا، اور اُس کا یہ خیال قابلِ فہم اسباب پر مبنی ہو، اور اُس نے کارروائی کرتے وقت احتیاط کے پہلو کو ملحوظ رکھا ہو"

اس عبارت سے دو بنیادی باتیں واضح ہوتی ہیں جو کارروائی کرنے والے کو ذمہ داری سے سبکدوش کر دیتی ہیں:

ایک یہ کہ سرکاری ملازم کو افسر کی طرف سے براہِ راست یا بالواسطہ حکم صادر ہوا ہو جس کی اطاعت اس پر فرض ہو۔ صرف یہ کافی نہیں ہے کہ ملازم یہ سمجھتا ہو کہ افسر کی اطاعت اُس پر فرض ہے۔ بلکہ اس خیال کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی یقین رکھتا ہو کہ خود زیرِ بحث حکم جو افسر کی طرف سے صادر ہوا ہے، اُس کے لیے واجب الاطاعت ہے۔ کیونکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ افسران اپنے ماتحت ملازموں کو ایسے احکام دے دیتے ہیں جو واجب الاطاعت نہیں ہوتے۔ ایسی صورت میں ماتحت کے لیے ایسے غیر قانونی حکم کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ اگر وہ ایسے کسی حکم کو نافذ کرے گا تو یہ اُس کی زیادتی ہوگی اور اس کی ذمہ داری اُسی کی گردن پر ہوگی۔

دوسری یہ کہ ملازم ثابت کرے کہ جو کارروائی وہ کر رہا تھا اُس کے بارے میں اُسے یقین تھا کہ وہ قانونی فعل ہے، اور اُس کا یہ یقین قابلِ فہم اسباب پر مبنی ہو، محض ظن وتخمین پر استوار نہ ہو (الوسیط۔ تالیف

ڈاکٹر السنہوری جلد اوّل۔ اشاعت ۱۹۵۲ء ص ۷۵۰ اور اس کے بعد)۔

بنا بریں جو لوگ مدّعی کو عذاب دیتے رہے ہیں اُن میں سے کوئی شخص بھی یہ دعوٰی نہیں کرسکتا کہ عذاب دے دے کر مارنا قانونی فعل ہے، یا قانونی فعل ہوسکتا ہے، یا اُسے قانونی فعل تصوّر کیا جاسکتا ہے۔

مذکورۂ بالا بحث کے بموجب ضمنی دعوے کے مدّعا علیہم سب (اور یہ سب وزیر جنگ کے ماتحتوں میں سے ہیں) نے ریاست کے دستور، تمام قوانین اور احکام کو پامال کیا ہے۔ تمام اخلاقی اقدار، بین الاقوامی ضابطوں اور انسانی اصولوں سے انحراف کیا ہے۔ اُن کے پاس اس کے سوا کوئی عذر نہیں ہے کہ شیطان نے انہیں خود فراموشی میں مبتلا کر دیا تھا اور اسی وجہ سے وہ خدا کو بھی فراموش کر بیٹھے اور غیر اللہ کی چوکھٹ پر انہوں نے جبہ سائی کی۔ اور جب اُن کے دل پتھر ہوگئے تو اُن کے اندر نہ خدا کا خوف رہا اور نہ خلق کی شرم۔ انہوں نے ایسے پابجولاں قیدیوں پر ستم ڈھایا جن کے پاس کوئی حیلہ و تدبیر تھی اور نہ کوئی طاقت۔ چنانچہ عدالت پر اُن کی درندگی اور ستمرانی ثابت ہوچکی ہے اور عدالت پورے اطمینان اور حق شناسی کے ساتھ یہ قرار دیتی ہے کہ ملزمان انسانیت سے قطعاً عاری تھے۔ انہوں نے مدّعی کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کیا ہے۔ یہ نہ صرف جرم ہے بلکہ سنگین، ہولناک اور غیر معمولی جُرم ہے۔

اب مدّعی کے نقصان کا معاملہ لیجیے۔ اذیت و تعذیب کے متعدد واقعات عدالت میں پیش کیے گئے ہیں۔ مدّعی کی توہین اور ہتک عزت کی تفصیلات سامنے آئی ہیں۔ اُسے ذلت و رسوائی اور آلام و مصائب کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اُس کے جسم پر تعذیب کے ایسے نشانات باقی ہیں جو طبی معائنے اور عکسی تصویر سے صحیح ثابت ہوچکے ہیں۔ مزید برآں مدّعی کے ذہن و قلب پر ایسے المیے اور پُرہول واقعات و مناظر ثبت ہوچکے ہیں جو شاید زندگی بھر اُس کے لیے کابوس بنے رہیں اور صرف جام اجل ہی انہیں محو کرسکے۔ یہ ایسا نقصان ہے جو اظہر من الشمس ہے اور اپنی کہانی اپنی زبان سے بیان کر رہا ہے۔

مدّعی نے جس ظلم و تعذیب اور تشدد و جور کا سامنا کیا ہے۔ عدالت کو اُس سے شدید دکھ پہنچا ہے۔ اور مدّعی نے اس آزمائش پر جو اُسے اپنے رب کی طرف سے پہنچی ہے جس طرح صبر کیا ہے اور جس دل گردے کے ساتھ اُسے برداشت کیا ہے۔ اور جس قوت ایمانی کا مظاہرہ کیا ہے گو عدالت اس کی پوری پوری قدر کرتی ہے مگر بایں ہمہ عدالت اُسے یہ کہنا چاہتی ہے کہ مدّعی وہ پہلا انسان نہیں ہے جس نے آلام و مصائب کے کولھو میں پل کر اور خاک و خون میں لت پت ہوکر حق پرستی کی گراں قیمت پیش کی ہو۔ بلکہ اس سے پہلے شہدائے مسیحیت بھی یہ قیمت پیش کرچکے ہیں۔

قابلِ قیمت اور محلِ احترام ہونے کا تصور ہر زمانے میں الگ الگ ہو سکتا ہے۔ ایک چیز قدیم زمانے میں ہیچ تھی مثلاً مٹی اور رکھاد۔ لیکن آج وہ قیمتی اشیاء میں شمار کی جاتی ہے۔

۳۔ بقدر نصاب ہو | مسروقہ مال کی تیسری شرط نصاب ہے۔ اس باب میں فقہائے امت کے درمیان دو بڑی رائیں پائی جاتی ہیں۔

ظاہریہ، حسن بصری، خوارج اور متکلمین کا ایک گروہ نصاب کی شرط کا قائل نہیں ہے۔ ان حضرات کے نزدیک مال مسروقہ کم ہو یا زیادہ قطع ید کی سزا عاید ہوگی۔ وہ دلیل یہ دیتے ہیں کہ سرقہ والی آیت کا حکم عام ہے اس میں قلیل یا کثیر کی کوئی حد نہیں مقرر کی گئی۔ نیز آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بھی وہ پیش کرتے ہیں کہ لعن اللہ السارق یسرق البیضۃ فتقطع یدہ ویسرق الحبل فتقطع یدہ (خدا چور پر لعنت بھیجے۔ ایک انڈا چوری کرتا ہے اور ہاتھ کٹوا لیتا ہے۔ ایک رسی چوری کرتا ہے اور ہاتھ کٹوا لیتا ہے)۔

لیکن جمہور فقہا کے نزدیک چور کے اس وقت تک ہاتھ نہ کاٹے جائیں گے جب تک وہ بقدر نصاب چوری نہ کرے۔ نصاب کی مقدار پر جمہور فقہاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے اور اس سلسلے میں دو بڑے گروہ نظر آتے ہیں؛

پہلا گروہ حجاز کے فقہاء: امام مالک، امام شافعی اور دیگر اصحاب کا ہے۔ ان کے نزدیک چوری کا نصاب تین درہم (چاندی کا سکہ) یا چوتھائی دینار (سونے کا سکہ) ہے۔ البتہ ان میں یہ اختلاف ہے کہ اگر مسروقہ مال سونے اور چاندی کے سوا کوئی اور سامان ہو تو اس کی مالیت درہموں کے حساب سے لگائی جائے گی یا دینار کے حساب سے۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ مالیت دینار کے حساب سے لگائی جائے گی۔ اور اگر مال مسروقہ کی کم از کم قیمت چوتھائی دینار ہوگی تو قطع ید کی سزا ہوگی ورنہ نہیں، خواہ درہموں کے لحاظ سے اس کی مالیت تین درہم بن جاتی ہو۔

دوسرا گروہ فقہائے عراق: امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگردوں کا ہے۔ ان کے نزدیک نصاب کی مقدار دس درہم ہے۔ دس درہم سے کم مالیت کی چوری پر قطع ید نہیں ہوگا۔ فقہائے عراق کی دلیل آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ ایک ڈھال کی قیمت سے کم کی چوری پر ہاتھ نہ کاٹے جائیں — حجازی فقہا کہتے ہیں کہ اس زمانے میں ڈھال کی قیمت تین درہم تھی اور عراقی فقہاء کہتے ہیں کہ دس درہم تھی۔

حاصل تھی جس کی بدولت اُسے معمولی سے معمولی دست درازی سے بھی محفوظ و مامون رہنا چاہیے تھا۔ ایسا انسان یکایک ایسی شدید بدمعاملگی، قساوت قلبی اور وحشت و درندگی کا نشانہ بن جاتا ہے جس کا کوئی شخص تصور بھی نہیں کر سکتا۔ چونکہ مدّعی خود عدلیہ کا ایک رکن تھا اور جج کا قول راست ہوتا ہے، اس لیے مدّعی نے اپنے نقصان کا جو معاوضہ طلب کیا ہے عدالت کی رائے میں وہ بالکل مناسب تخمینہ ہے اور نقصان کی تلافی کا صحیح اندازہ ہے۔

عدالت چاہتی ہے کہ مدّعی کا اعتماد اپنی ذات پر بھی اور اپنے وطن پر بھی بحال ہو۔ اس لیے عدالت اُس پورے معاوضے کو ادا کرنے کا فیصلہ دیتی ہے جو مدّعی نے طلب کیا ہے۔ اتنی رقم اگر مدّعی کے پاس اس وقت ہوتی جب وہ عذاب کی بھٹی میں جل رہا تھا تو اگر اُس کے بس میں ہوتا کہ وہ اس رقم کو ادا کر کے جان بخشی کر والے تو وہ کبھی دریغ نہ کرتا۔

فیصلہ ضمنی دعوے کے مدّعا علیہم اپنی ضرر رساں کارروائیوں کے خود ذمہ دار ہیں۔ نقصان کا معاوضہ دینے میں وہ باہم شریک ہیں۔ جیسا کہ قانون کی دفعہ ۱۶۹ میں کہا گیا ہے کہ مورث کا ترکہ وصول کرنے والے وارث اُس کی ذمہ داریوں میں بھی شریک ہوں گے۔

یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ عدالتی فیصلے کا فوری نفاذ ہو اور یہ فیصلہ قابلِ ضمانت نہ ہو۔ عدالتی فیصلہ اس نقصان کی تلافی کرتا ہے جو مدّعی کو ہتک عزت، شخصی آزادی کی پامالی اور الم و تشدد کی شکل میں پہنچا ہے۔ یہ تمام امور اپنی فطرت کے لحاظ سے فوری تلافی کے محتاج ہیں۔ فیصلے کے نفاذ میں تاخیر محکوم (مدّعی) کے مفاد کو ضرر پہنچا سکتی ہے۔ عدالت کو دفعہ ۲۹۰ الف اپیل کے تحت یہ حق حاصل ہے کہ وہ حکم جاری کر سکتی ہے۔ بنا بریں یہ عدالت اپنے فیصلے کے فوری نفاذ اور بلا ضمانت نفاذ کا حکم جاری کرتی ہے نیز مذکورہ بالا اسباب کی بنا پر:

۱۔ عدالت بنیادی دعوے کے بارے میں یہ فیصلہ دیتی ہے کہ مدّعا علیہ جنرل وزیر جنگ فوجی جیل کے ذمہ دار افسر کی حیثیت سے مدّعی الاستاذ علی جریشہ کو تیس ہزار پاؤنڈ معاوضہ، نیز مصارف مقدمہ اور دس پونڈ معاوضہ وکیل ادا کرے۔ یہ فیصلہ فوری طور پر نافذ العمل اور ناقابلِ ضمانت ہے۔

۲۔ عدالت ضمنی دعوے کے مدّعا علیہم شمس بدران، حمزہ لبسیونی کے ورثا، سعد زغلول کے ورثا، حسن خلیل، حسن کفافی اور محمد صفوت الروبی کے بارے میں یہ فیصلہ دیتی ہے کہ وہ اشتراک باہمی کے طور پر جنرل وزیر جنگ کو تیس ہزار پونڈ ادا کریں جو بنیادی دعوے میں وزیر جنگ پر عائد کیے گئے ہیں۔ نیز مصارف مقدمہ اور معاوضہ وکیل دس پونڈ بھی ادا کریں۔

۳ - عدلیہ جو قوم کا ضمیر، اور اُس کا شعور و وجدان ہے یہ اعلان کرتی ہے کہ یہ قوم اور ملک ہر اُس شخص سے بری الذمہ ہے جس نے قوم کو ذلیل کرنے اور شہریوں کو اذیت دینے میں کسی نہ کسی صورت حصّہ لیا ہے۔

۴ - قومی احساس کا لحاظ کرتے ہوئے اور مصر کی شریف قوم کا وقار بحال کرنے کی خاطر عدالت صدر جمہوریہ سے یہ اپیل کرتی ہے کہ وہ فوجی جیل کو مسمار کرنے کا حکم جاری کریں۔ کیونکہ اگر یہ جیل باقی رہی تو قوم کی تذلیل اور ابنائے قوم کی تعذیب کی یادگار باقی رہے گی۔ اور اس کے در و دیوار نہایت افسوسناک، الم انگیز اور منحوس دنوں کی یاد دلاتے رہیں گے۔ چنانچہ صدر جمہوریہ اسے مسمار کروا کر اس کی جگہ مفید اجتماعی اور ثقافتی ادارے قائم کروائیں۔

۵ - عوام کے حقوق کی حفاظت کے لیے، اور عوام کا یہ حق منوانے کے لیے کہ انہیں آزاد عدلیہ کی ضرورت ہے، نیز معاشرے کی سلامتی اور امن کے تحفظ کے لیے عدالت اپنے اس فیصلے کو اٹارنی جنرل کے نام سابق وزرائے انصاف بدوی حمودہ اور عصام الدین حسونہ کے خلاف نوٹس قرار دیتی ہے کہ ان دونوں وزیروں نے عدلیہ کے تقدس کی حفاظت میں جو اس ملک کے لیے حفاظتی قلعہ کی حیثیت رکھتی ہے کوتاہی برتی ہے۔ عدلیہ پہ دست درازی ہوتی رہی مگر یہ دونوں وزیر نہ صرف اس دست درازی کا کھڑے تماشا دیکھتے رہے بلکہ اس پہ پردہ پوشی کی مذموم کوشش کرتے رہے۔ اسی طرح عدالت اٹارنی جنرل کی وساطت سے سابق وزرائے انصاف محمد ابونصیر اور مصطفیٰ کامل اسماعیل کے نام بھی نوٹس جاری کرتی ہے، جنہوں نے عدلیہ کے اختیارات کے خلاف سازش کی، عدالتی نظام کو جان بوجھ کر تباہ کرنے کی کوشش کی اور عدلیہ کی آزادی کو مجروح کر کے اور ارکان عدلیہ کو نقصان پہنچا کر شہریوں کے دل میں عدلیہ کا اعتماد ختم کیا۔

عدالت کے رجسٹرار کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اس فیصلے کی سرکاری نقل تحریر کریں اور اسے اٹارنی جنرل کے نام باقاعدہ جاری کریں۔

رسائل و مسائل

درود میں "سیدنا و مولانا" کا استعمال

اور بعض اہم اُصولی بحثیں

سوال:- "آپ نے ماہ مارچ کے "ترجمان القرآن" میں کسی سائل کو جواب دیتے ہوئے نماز میں درود کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اُس پر حسب ذیل اعتراضات وارد ہوتے ہیں:

۱- آپ نے ابوداؤد اور دارقطنی کے حوالہ سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سکھائے ہوئے تشہد میں "رَحْمَةُ اللهِ" کے بعد "وَبَرَكَاتُهُ" کا، اور "اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ" کے بعد "وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ" کا اضافہ کر دیا۔ اس سے آپ ماثور الفاظ پر اضافے کا جواز ثابت کرتے ہیں، لیکن یہ آپ کے لیے مفید مطلب نہیں ہے، کیونکہ یہ الفاظ مرفوع حدیث میں بھی وارد ہوتے ہیں۔

۲- تشہد کے متعلق آپ نے حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی یہ روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے اُن کو عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ تک تعلیم دینے کے بعد فرمایا کہ "جب تم نے یہ پڑھ لیا (یا اس کو پورا کر لیا) تو تم اپنی نماز سے فارغ ہو گئے، اِس کے بعد اُٹھ جانا چاہو تو اُٹھ جاؤ اور بیٹھنا چاہو تو بیٹھے رہو"۔ اس سے آپ نے یہ استدلال کیا ہے کہ عبدہٗ و رسولہٗ پر نماز مکمل ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد آدمی کچھ نہ پڑھے تب بھی اس کی نماز میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا، اور درود و دُعا تشہد میں داخل نہیں ہے بلکہ اس سے زائد ایک چیز ہے۔ مگر آپ کا یہ استدلال صحیح نہیں ہے، کیونکہ حُفّاظِ حدیث کا اِس پر اتفاق ہے کہ عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ کے بعد کا مضمون

دراصل حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے جسے ایک راوی نے بے احتیاطی سے اس طرح حدیث میں درج کر دیا ہے کہ وہ حضورؐ کا ارشاد معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ بالفرض اگر وہی روایت صحیح تسلیم کر لی جائے جس سے آپ استدلال کرتے ہیں، تو یہ امر واقعہ ہے کہ تشہد کی تعلیم حضورؐ نے ابتدائی دور ہی میں دے دی تھی جب نماز فرض ہوئی تھی، لیکن قرآن مجید میں حضورؐ پر درود و سلام بھیجنے کا حکم غزوۂ خندق اور غزوۂ بنی قریظہ کے زمانے یعنی ۵ھ میں نازل ہوا تھا، کیونکہ وہ سورۂ احزاب میں درج ہے، اور وہ انہی غزوات کے زمانے میں نازل ہوئی تھی۔ اس لیے لامحالہ بعد کی چیز نے پہلے کی چیز کو منسوخ کر دیا۔

۴۔ نماز تعبّدی اعمال میں سے ہے، اور ان اعمال کے بارے میں یہ قاعدہ مسلّم ہے کہ شارع نے اُن کی تعلیم جس طرح دے دی ہے اسی طرح اُن کی تعمیل کی جانی چاہیے، ان کے اندر اپنی طرف سے کوئی تصرف نہیں کیا جاسکتا۔ علماءِ اصول اس بات پر متفق ہیں کہ عبادات میں اصل حکم کی پیروی اور شارع کے بتائے ہوئے طریقے کا اتباع ہے، اور اُس سے تجاوز بدعت ہے۔ لیکن آپ درود کے ماثور الفاظ پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ ان میں اضافے ہی نہیں ردّو بدل[1] اور کمی بیشی تک کے قائل ہیں۔ حالانکہ نماز کے تمام اَوراد توقیفی ہیں، ان میں نہ کچھ گھٹانا جائز ہے نہ بڑھانا۔

۵۔ درود کے الفاظ میں سیدنا و مولانا کا اضافہ متعدد وجوہ سے ناجائز ہے:

اوّلاً احادیث سے جتنے درُود ثابت ہیں ان میں کہیں یہ الفاظ مستعمل نہیں ہوئے ہیں بلکہ بقول حافظ ابن حجر کسی صحابی و تابعی نے بھی یہ الفاظ درود میں استعمال نہیں کیے ہیں۔

ثانیاً، احادیث سے ثابت ہے کہ لفظ سید کا استعمال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے لیے اس دنیا میں بالکل غیر مشروع ہے اور حضورؐ نے اپنے لیے اس کے استعمال

[1] میں نے ردّو بدل کے الفاظ کہیں استعمال نہیں کیے ہیں۔ صرف کمی بیشی کا ذکر کیا ہے۔ تاہم اگر معترضین کو اصرار ہو کہ میں ردّو بدل کا بھی قائل ہوں تو میں اپنے جواب میں اس کی نظیر بھی پیش کر دوں گا۔ مودودی

کو منع فرمایا ہے۔ رہا آپؐ کا ارشاد کہ "انا سید ولد آدم" تو یہ قیامت کی حکایت ہے، جہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ کو یہ اعزاز دنیا میں عبدیت کا شیوہ اختیار کرنے کے صلے میں عطا کیا جائے گا، چنانچہ قاضی عیاض نے شفا میں روایت نقل کی ہے کہ اسرافیل نے حضورؐ سے کہا" اللہ تعالیٰ نے اُس تواضع (انکساری) کے صلے میں جو آپ نے اللہ تعالیٰ کے حضور اختیار کی ہے آپ کو یہ مرتبہ عطا کیا ہے کہ آپ قیامت کے روز اولاد آدم کے السید (سردار) ہوں گے"۔ نیز حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ جبریل علیہ السلام کی موجودگی میں ایک فرشتے نے حضورؐ کے پاس آکر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پوچھا" آپ کو بادشاہ رسول بناؤں یا عبد رسول" جبریلؑ نے حضور کو اشارہ کیا کہ" آپ اپنے رب سے تواضع سے پیش آئیے"۔ تب آپؐ نے اُس فرشتے کو جواب دیا" بلکہ عبد رسول"۔ اسی لیے حضورؐ نے اپنے لیے لفظ سید کا استعمال پسند نہیں فرمایا اور اپنی دعاؤں میں انتہائی عاجزی اختیار کی۔

ثالثاً، حضورؐ نے غزوۂ بنی قریظہ کے موقع پر جب حضرت سعد بن معاذ کے لیے لوگوں سے کہا قوموا الی سیدکم (اپنے سردار کے استقبال کے لیے کھڑے ہو جاؤ) تو حضرت عمرؓ کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا کہ السید هو الله (سید تو اللہ ہی ہے)۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ حضرت سعد بن معاذ والا واقعہ ۵ھ ہجری کا ہے، اور حضور نے اپنے لیے لفظ سید کے استعمال پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے السیدُ اللہُ ۹ھ ہجری میں فرمایا تھا جب بنی عامر کا وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔

رابعاً، درود اصل میں ایک دعا ہے، اور دعا میں مدعولہ کے لیے سید کا لفظ استعمال کرنا روحِ دعا کے خلاف ہے۔ درخواست اور دعا میں تو عاجزی و انکساری اور عبدیت کا اظہار ہونا چاہیے۔ جس کے حق میں دعا کی جاتی ہے اس کے لیے تو یوں کہا جاتا ہے کہ ایک عبد مسکین حاضر خدمت ہے، نہ یہ کہ ہمارا آقا اور سردار حاضر ہو رہا ہے"۔

جواب:- آپ نے جو اعتراضات پیش فرمائے ہیں وہ بلاشبہ قابلِ توجہ ہیں اور میں ایسے اعتراضات پر بحث کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہوں۔ ذیل میں اُن کا سلسلہ وار جواب حاضر ہے۔

تشہد میں ابن عمرؓ کا تصرف میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے جس بات پر استدلال کیا ہے

اُس پر اعتراض کرنے سے پہلے اگر آپ نے دو منٹ بھی غور کر لیا ہوتا تو یہ نہ فرماتے کہ "یہ حدیث آپ کے لیے مفید مطلب نہیں ہے، کیونکہ یہ الفاظ مرفوع حدیث میں بھی وارد ہوئے ہیں"۔ براہ کرم ایک مرتبہ پھر حضرت عبداللہ بن عمر کے الفاظ کو پڑھیے۔ وہ فرما رہے ہیں کہ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ کے بعد وَبَرَکَاتُہٗ اور اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے بعد وَحْدَہٗ لَا شَرِیْكَ لَہٗ کا اضافہ میں نے خود کر دیا۔ اِس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ جس وقت اُنہوں نے یہ اضافہ کیا تھا اُس وقت اُن کے علم میں وہ حدیث مرفوع نہیں تھی جس کے متعلق آپ کہہ رہے ہیں کہ اُس میں بھی یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اُن کے علم میں کبھی نہ آئی ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اُن کے علم میں اُس وقت آئی ہو جبکہ وہ پہلے ہی بطورِ خود اِن الفاظ کا اضافہ کر چکے ہوں۔ یہ بھی تحقیق فرما لیجیے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ دارقطنی نے اسے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ھٰذا اِسْنَادٌ صَحِیْحٌ (یہ سند صحیح ہے) اور حافظ ابن حجرؒ نے ابوداؤد کی روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔ یہ صریح طور پر آپ کے مدعا کے خلاف پڑتی ہے، کیونکہ اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک جلیل القدر صحابی نے نماز کے ماثور الفاظ پر اپنی طرف سے کچھ الفاظ کا اضافہ کیا اور اُس کا لوگوں کے سامنے اظہار بھی کر دیا، مگر نہ دورِ صحابہ و تابعین میں اِس پر کوئی گرفت کی گئی اور نہ بعد کے کسی دور میں (کم از کم میرے علم کی حد تک) کسی فقیہ یا محدث نے اِسے صحابیِ رسول کی بدعتِ ضلالت قرار دیا۔

تشہد کے متعلق ابن مسعودؓ کی روایات | میں نے تشہد کے متعلق حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی جو روایت نقل کی ہے، اُس کے متعلق آپ کہتے ہیں کہ عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ کے بعد والے الفاظ کو حفاظِ حدیث نے بالاتفاق الحاقی قرار دیا ہے اور یہ رائے ظاہر کی ہے کہ دراصل یہ حضرت ابن مسعودؓ کا اپنا قول ہے جو راوی کی غلطی سے حضورؐ کی طرف منسوب ہو گیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ رائے کن حفاظِ حدیث نے ظاہر کی ہے۔ مگر اُن کے فضل و کمال کا انتہائی معترف و معتقد ہونے کے باوجود میں اُن کا اندھا مقلد نہیں ہوں کہ بس یہ سن کر کہ وہ اِن الفاظ کے الحاقی ہونے پر متفق ہیں، خود بھی انہیں الحاقی مان لوں اور یہ نہ دیکھوں کہ جس بنیاد پر اُنہوں نے یہ فیصلہ کر ڈالا ہے وہ بجائے خود معقول بھی ہے یا نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ حدیث چار مختلف صورتوں میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے منقول ہوئی ہے۔

ایک صورت میں عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ کے بعد اِذَا قُلْتَ ھٰذَا کے الفاظ بالکل متصل ہیں اور کوئی علامت ایسی نہیں پائی جاتی جس سے یہ شبہ کیا جا سکے کہ یہ بعد کے الفاظ حضورؐ کے نہیں بلکہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود

کے ہیں۔ اس کے متعلق یہ دعویٰ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ حضورؐ کا کلام فلاں جگہ ختم ہوا اور فلاں جگہ سے حضرت عبداللہؓ بن مسعود کا کلام شروع ہوگیا۔

دوسری صورت اِس حدیث کی یہ ہے کہ وہ عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ پر ختم ہوگئی ہے اور بعد کی عبارت اُس میں سرے سے مذکور ہی نہیں ہوئی ہے۔ یہ ترکِ ذکر قطعاً اِس بات کی دلیل نہیں قرار پاسکتا کہ اوپر والی روایات میں جو زائد عبارت مذکور ہوئی ہے وہ اِلحاقی ہے۔

تیسری صورت اِس حدیث کی یہ ہے کہ عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ کے بعد قَالَ یا ثُمَّ قَالَ فاذا فعلت هذا .... کے الفاظ ہیں۔ اِس لفظ قَالَ یا ثُمَّ قَالَ سے قطعاً یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ قائل کون ہے۔ اس کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا، اور یہ بھی کہ عبداللہؓ بن مسعود نے فرمایا۔ دونوں احتمالوں میں سے ایک کو ترجیح دینے کے لیے خود اِس روایت میں کوئی گنجائش نہیں۔

چوتھی قسم کی روایات وہ ہیں جن میں عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ کے بعد قَالَ عَبْدُ اللّٰہ یا قال ابنُ مسعود کے الفاظ ہیں اور پھر فَاِذَا فعلتَ هٰذَا سے آخر تک کی عبارت نقل کی گئی ہے۔ جن حُفّاظِ حدیث نے صرف اِن آخری قسم کی روایات کو اِس بات کی دلیل بنایا ہے کہ پہلی قسم کی روایات میں جو عبارت حضورؐ کے ارشاد سے متصل پائی جاتی ہے وہ دراصل اِلحاقی ہے، اُن کی جلالتِ شان کا پورا اعتراف کرتے ہوئے میں عرض کرتا ہوں کہ حدیث کی روایات میں اِس طرح کے فیصلے صادر کر دینا فنِ حدیث کی قدر و منزلت کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔ آخر یہ رائے قائم کرنے میں کیا مشکل حائل تھی کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود خود بھی اُسی بات کا فتویٰ دیتے تھے جو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی تھی؟ پہلی قسم کی احادیث میں انہوں نے قولِ رسولؐ نقل کیا ہے، اور آخری قسم کی احادیث میں خود اپنا فتویٰ بیان کیا ہے جو عین قولِ رسول کے مطابق ہے۔ اگر اُن کا فتویٰ اُن کی روایت کردہ حدیث کے خلاف ہوتا تو ضرور حدیث مشکوک ہوجاتی۔ لیکن وہ تو حدیث کے ٹھیک مطابق فتویٰ دے رہے ہیں۔

کیا ابن مسعودؓ سورۂ احزاب سے ناواقف تھے؟ تیسرے اعتراض میں آپ نے جو کچھ فرمایا ہے، اس میں ذرا اس بات کی وضاحت اور فرما دیجیے کہ جس وقت کوفے میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود حضرت عَلْقَمہ اور اپنے دوسرے شاگردوں سے تَشَہُّد کے متعلق یہ حدیث بیان کر رہے تھے، اُس وقت سورۂ احزاب نازل ہوچکی تھی یا نہیں؟ اور اگر نازل ہوچکی تھی (جس کا شاید آپ انکار نہیں کرسکتے) تو ابن مسعودؓ رضی اللہ عنہ اُس سے واقف تھے یا ناواقف؟

اِس کی آپ وضاحت کردیں گے تو اعتراض کا جواب آپ کو خود ہی مل جائے گا۔

درود و دعا کے ماثور الفاظ کی پابندی کیوں لازم نہیں ہے؟

تعبّدی اعمال (یعنی عبادت کی نوعیت رکھنے والے اعمال) کے بارے میں جس متفق علیہ شرعی قاعدے کا آپ نے ذکر کیا ہے، اس کا میں بھی شدت سے قائل ہوں اور بیس سال پہلے خود اُس کو بیان کرچکا ہوں[1]۔ لیکن آپ کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ تشہّد کے بعد پڑھنے کے لیے درود و دعا کے جو الفاظ ماثور ہیں اُن کی نوعیت بھی ایسی ہے کہ اُن کو جوں کا توں پڑھنا ہی ضروری ہو، کیونکہ بخاری، مسلم، نسائی، ابوداؤد اور مُسند احمد میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایات یہ بتاتی ہیں کہ عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ تک تشہد پڑھنے کے بعد آدمی کو اختیار ہے کہ اللہ سے مانگنے کے لیے جو دعا چاہے منتخب کرلے۔

تعبّدی اُمور میں ردّ و بدل اور کمی بیشی کی گنجائش

علاوہ بریں احادیث میں متعدد نظیریں ایسی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قاعدۂ کلیہ استثناء کی گنجائش سے خالی نہیں ہے۔ اُن میں صرف بیشی (یعنی اضافے) ہی کے نہیں بلکہ ردّ و بدل اور کمی کے نظائر بھی پائے جاتے ہیں جن کو میں مختصراً یہاں نقل کرتا ہوں۔

"ردّ و بدل" کی ایک صریح مثال

"ردّ و بدل" کی نمایاں ترین مثال حضرت ابوبکرؓ صدیق کے زمانے میں جمع قرآن ہے۔ احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد مبارک میں قرآن کو لکھوا تو ضرور دیا تھا، مگر وہ متفرق پارچوں، تختیوں، کھجوروں کی چھالوں، شانے کی ہڈیوں اور ایسی ہی دوسری چیزوں پر لکھا گیا تھا جو ایک تھیلے میں رکھی ہوئی تھیں۔ حضورؐ نے اُسے سورتوں کی ترتیب کے ساتھ کہیں یکجا نہیں لکھوایا تھا۔ اِس کے بعد جب حضرت ابوبکرؓ صدیق کا دورِ خلافت آیا اور فتنۂ ارتداد کی آگ بھڑک اُٹھی تو مرتدین سے لڑائیوں میں، خصوصاً جنگِ یمامہ میں بہت سے حُفّاظ شہید ہوگئے۔ بخاری، ترمذی، مُسند احمد، مُسند ابوداؤد طیالسی اور دوسری کتب حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ اِس صورتِ حال میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خطرہ محسوس ہوا کہ اگر اسی طرح حُفّاظ شہید ہوتے رہے تو قرآن کا بہت سا حصّہ ضائع ہوجائے گا۔ اِس خطرے کو اُنہوں نے سیدنا ابوبکرؓ صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کرکے یہ رائے دی کہ آپ قرآن کو جمع کرنے کا حکم دیں۔ حضرت صدیقؓ نے جواب دیا کہ میں وہ کام کیسے کرسکتا ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا؟ مگر حضرت عمرؓ

[1] ملاحظہ فرمائیں تفہیمات، حصّہ سوم، مضمون "قانون سازی، شوریٰ اور اجماع"۔ اِسی مضمون کے آخر میں اس کی تاریخِ اشاعت مئی ۱۹۵۵ء درج ہے۔

نے کہا ھو واللہ خیر۔ "بخدا یہ اچھا کام ہے"۔ اور وہ برابر اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ حضرت صدیقؓ کو اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے پورا شرح صدر عطا کر دیا اور وہ حضرت عمرؓ کی رائے سے متفق ہو گئے۔ پھر حضرت عمرؓ کی موجودگی میں حضرت ابوبکرؓ نے حضرت زیدؓ بن ثابت کو بلا کر قرآن جمع کرنے کا حکم دیا۔ حضرت زیدؓ نے بھی اس پر وہی بات کہی جو ابتداء میں حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ سے کہہ چکے تھے۔ انہوں نے عرض کیا کہ آپ لوگ کیسے وہ کام کر رہے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا؟ دونوں صاحبوں نے ان کو جواب دیا ھو واللہ خیر۔ اور دونوں صاحب اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت زیدؓ کو بھی اس معاملہ میں شرح صدر عطا فرما دیا۔ اس طرح جمع قرآن کا وہ عظیم کام شروع کیا گیا جسے انجام دینے میں بکثرت صحابہ نے حصہ لیا، اور تمام ہی صحابہ کے علم میں رفتہ رفتہ یہ بات آگئی کہ خلیفۂ وقت کی نگرانی میں یہ کام کیا جا رہا ہے۔ اب ملاحظہ فرمائیے۔ یہ کام ظاہر ہے کہ دنیوی تدابیر میں سے نہیں بلکہ تعبّدی اعمال میں سے تھا۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت زیدؓ بن ثابت نے اسی وجہ سے حضرت عمرؓ کی تجویز سنتے ہی اس کے جواب میں یہ فرمایا تھا کہ وہ کام کیسے کیا جائے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا؟ مگر جس دلیل کی بنا پر حضرت عمرؓ نے یہ تجویز پیش کی تھی، اور جس کی بنا پر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت زیدؓ بن ثابت کو اس کے جواز، بلکہ وجوب پر شرح صدر حاصل ہوا وہ هُوَ وَاللّٰهِ خَيْرٌ کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ اس کے بعد جو کام کیا گیا وہ صریحاً ردّ و بدل کی نوعیت رکھتا تھا، کیونکہ اس کے ذریعہ سے قرآن کی اس متفرق حالت کو، جو حضورؐ کے زمانے میں تھی، ردّ کر کے یکجائی حالت میں تبدیل کر دیا گیا۔ مگر نہ کسی نے اس وقت اسے بدعت اور احداث فی الدین قرار دیا اور نہ آج تک کوئی اس پر یہ اعتراض کر سکا ہے، بلکہ اسے جناب صدیق اکبرؓ کی اہم ترین دینی خدمات میں شمار کیا جاتا ہے۔

کمی کی ایک نمایاں مثال اب ذرا "کمی" کی بھی ایک نمایاں ترین مثال ملاحظہ فرمائیے۔ بخاری، مسلم، نسائی، ترمذی، ابوداؤد وغیرہ کتب حدیث میں صحیح ترین سندوں سے یہ بات منقول ہوئی ہے کہ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا تھا۔ اکابر اہل علم نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ قرآن مجید ابتداء میں تو صرف قریش کی زبان میں نازل ہوا تھا، مگر بعد میں جب اسلام عرب کے مختلف علاقوں میں پھیلنے لگا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی درخواست پر عرب کی چھ فصیح ترین بولیوں (DIALECTS) میں بھی اس کے پڑھنے کی اجازت دے دی گئی جن میں تلفظ، اعراب، یا مصادر کا صرف ایسا فرق ہوتا تھا جس سے معنی میں کوئی فرق واقع نہ ہوتا تھا۔ لیکن یہ اجازت ایسی کھلی اجازت نہ تھی کہ مختلف علاقوں کے لوگ اپنی اپنی بولیوں میں قرآن کو خود بدل لیں، بلکہ جبریل امین اللہ تعالیٰ

کی طرف سے حضورؐ کو بتاتے تھے کہ کس لفظ کو قریش کی بولی کے سوا عرب کی دوسری بولیوں میں کس طرح پڑھا جائے، اور اُسی کے مطابق حضورؐ لوگوں کو قرآن پڑھنا سکھاتے تھے۔ اِس بنا پر ساتوں حرفوں پر قرآن کی سب قرأتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ تھیں اور توقیفی تھیں۔ بخاری میں حضرت عبداللہؓ بن عباس کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "جبریلؑ نے مجھے پہلے صرف ایک حرف پر قرآن پڑھایا تھا، پھر میں برابر اُن سے رجوع کر کے زیادہ حرفوں پر پڑھنے کی اجازت مانگتا رہا، یہاں تک کہ سات حرفوں تک پڑھنے کی اجازت دے دی گئی۔ مسلم کی روایت میں امام زُہری کے حوالہ سے اِس پر اتنا اضافہ اور ہے کہ یہ اجازت صرف اُن اُمور تک تھی جن سے حلال و حرام کا فرق نہ واقع ہوتا تھا۔ مسلم، نسائی، ابوداؤد، ترمذی اور طبری نے حضرت اُبیّ بن کعب کی روایت نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرأتِ قرآن میں یہ توسّع ہجرت کے بعد ہوا ہے۔ اِس روایت میں یہ ذکر ہے کہ مدینے کے ایک مقام اَضاۃِ بنی غِفار میں جبریل السلام حضورؐ کے پاس آئے اور انہوں نے کہا کہ اللہ آپ کو حکم دیتا ہے کہ آپ اپنی اُمت کو قرآن ایک حرف پر پڑھائیں۔ حضورؐ نے عرض کیا کہ میں اِس حکم میں نرمی کی درخواست کرتا ہوں، میری اُمت اِس کی طاقت نہیں رکھتی (یعنی جو لوگ عربی زبان کی ایک خاص بولی کے عادی ہیں ان کے بچوں، بوڑھوں، جوانوں، مردوں اور عورتوں کے لیے یہ مشکل ہے کہ کسی دوسری بولی میں قرآن پڑھ سکیں)۔ پھر وہ دو اور اُس کے بعد تین بولیوں میں پڑھنے کا حکم لائے اور حضور مزید کی درخواست فرماتے رہے۔ آخر کار اُنہوں نے آکر کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو سات حرفوں پر قرآن پڑھانے کا حکم دیتا ہے، ان میں سے جس حرف پر بھی لوگ پڑھیں گے وہ صحیح ہوگا۔

مسلم، نسائی اور طبری میں حضرت اُبیؓ بن کعب کا ایک اور بیان روایت ہوا ہے کہ اُن کی موجودگی میں یکے بعد دیگرے دو آدمی مسجد نبوی میں آئے اور ہر ایک نے قرآن اُس طریقے کے خلاف پڑھا جس طریقے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اُبیّ کو پڑھنا سکھایا تھا، اور اُن کی قرأتیں آپس میں بھی ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ حضرت اُبیّ ان دونوں کو ساتھ لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اِس اختلافِ قرأت کا ذکر کیا۔ حضورؐ نے اُن دونوں کی قرأت سُنی اور ہر ایک کی قرأت کو صحیح قرار دیا۔ حضرت اُبیّ کہتے ہیں کہ "یہ بات سُن کر میرے دل میں ایسی تکذیب پیدا ہوئی جو جاہلیت کے زمانے میں بھی نہ تھی"۔ طبری کی روایت میں اُن کے الفاظ ہیں کہ "میں نے اپنے اندر ایسا شیطانی وسوسہ پایا جس سے میرا چہرہ سُرخ ہوگیا"۔ یہ حالت دیکھ کر حضورؐ نے میرے سینے پر ہاتھ مارا جس سے میں پسینے پسینے ہوگیا۔ پھر حضورؐ نے مجھے بتایا کہ قرآن سات حرفوں پر نازل

ہوا ہے جو سب کے سب شافی و کافی ہیں۔ اسی سلسلے میں ایک اور روایت بخاری و مسلم اور ترمذی و نسائی میں حضرت عمرؓ سے منقول ہوئی ہے کہ میں نے ایک روز ہشام بن حکیم بن حزامؓ کو سورۂ فرقان پڑھتے سُنا اور اُن کی قرأت کو اُس قرأت سے مختلف پایا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے سکھائی تھی۔ ایک روایت میں حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ میں نے اُن سے پوچھا یہ قرأت تمہیں کس نے سکھائی ہے؟ انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ ایک اور روایت میں وہ فرماتے ہیں کہ میں اُن کا ہاتھ پکڑ کر انہیں حضور کے پاس لے گیا۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ میرا جی چاہتا تھا کہ انہیں اسی وقت پکڑ لوں، مگر میں نے ان کی نماز ختم ہونے تک صبر کیا، پھر ان کا گریبان پکڑ کر حضورؐ کے پاس لے گیا۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ قریب تھا کہ میں ان پر جھپٹ پڑتا، مگر میں نے ان کے سلام پھیرنے تک صبر کیا، پھر اُن کا گریبان پکڑ کر حضورؐ کے پاس لے گیا۔ اِس کے آگے سب روایتیں متفق ہیں کہ حضورؐ نے پہلے حضرت ہشام کی قرأت سُنی اور فرمایا ٹھیک ہے، اِسی طرح یہ سورۃ نازل ہوئی ہے۔ پھر آپ نے حضرت عمرؓ کی قرأت سُنی اور فرمایا ٹھیک ہے، اِسی طرح نازل ہوئی ہے۔ اِس کے بعد آپ نے وضاحت فرمائی کہ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے، لہٰذا جس طرح آسانی ہو، پڑھو۔

اِن روایات سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ ساتوں حرفوں پر قرأت توقیفی یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر تھی، ہر ایک حرف پر قرآن نازل ہوا تھا، اور لوگ بطور خود اپنی بولی میں قرآن کے الفاظ کو منتقل نہیں کر لیتے تھے، بلکہ حضورؐ نے ہر حرف پر لوگوں کو قرآن پڑھنا سکھایا تھا۔ دوسری بات یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ قرأتوں کے اِس اختلاف پر جھگڑے خود حضورؐ کے سامنے شروع ہو گئے تھے، مگر آپ نے اِن مختلف قرأتوں کی توثیق فرمائی اور جھگڑوں کی بنا پر قریش کی بولی کے سوا باقی سب بولیوں کی قرأت منسوخ کرنے کا اعلان نہیں فرمایا۔

اب ذرا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے کی طرف آیئے۔ اُن کے جمعِ قرآن کے بارے میں صحیح ترین حدیث وہ ہے جو بخاری میں ابراہیم بن سعد، عن الزُّہری، عن اَنسؓ بن مالک کی سند سے روایت ہوئی ہے۔ اس میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت حُذَیفہؓ بن الیمان آرمینیہ و آذربیجان کی مہم سے واپس آکر امیرالمومنین کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُنہوں نے قرآن کی قرأت میں لوگوں کا جو اختلاف دیکھا تھا اس سے وہ سخت پریشان تھے۔ آتے ہی

لہ واضح رہے کہ یہ صاحب فتح مکہ کے موقع پر ایمان لائے تھے۔ اِس لیے جس واقعہ کا حضرت عمرؓ نے ذکر کیا ہے وہ لامحالہ فتح کے بعد ہی کسی زمانے میں پیش آیا ہوگا۔

اُنہوں نے عرض کیا کہ اے امیر المومنین، اِس اُمت کو سنبھال لیجیے قبل اِس کے کہ کتاب اللہ میں ان کے اندر یہود و نصاریٰ جیسا اختلاف رونما ہو جائے۔ اِس پر حضرت عثمانؓ نے ام المومنین حضرت حفصہؓ کو کہلا بھیجا کہ وہ صحیفے ہمیں بھیج دیجیے جو آپ کے پاس ہیں، ہم اُن کی نقلیں کرا کے آپ کو واپس بھیج دیں گے۔[1] چنانچہ وہ انہوں نے بھیج دیے۔ پھر حضرت عثمانؓ نے حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت عبداللہؓ بن زبیر، حضرت سعیدؓ بن العاص، اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن الحارث بن ہشام کو حکم دیا کہ اُن کو مصحفوں میں نقل کریں، اور ہدایت فرمائی کہ جہاں تینوں قریشی حضرات اور حضرت زید بن ثابت کے درمیان اختلاف واقع ہو وہاں قریش کی زبان میں کتابت کی جائے کیونکہ قرآن دراصل اِسی زبان میں نازل ہوا تھا پھر یہ مصحف جو تیار کرائے گئے تھے ان کا ایک ایک نسخہ مختلف علاقوں کے مرکزی مقامات پر بھجوا دیا گیا[2] اور امیر المومنین کی طرف سے حکم دے دیا گیا کہ ہر صحیفہ یا مُصحف جو اِس مستند نسخے کے خلاف ہو جلا ڈالا جائے۔

اِس معاملے میں آپ یہ صاف دیکھ سکتے ہیں کہ قریش کی زبان کے سوا باقی چھ زبانوں کی قرأتیں، جو سب کی سب توقیفی تھیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سکھائی ہوئی تھیں، اِس مصلحت کی بنا پر منسوخ کر دی گئیں کہ اُمت کو قرآن کے الفاظ اور اِس کی عبارتوں میں اختلاف کے فتنے اور خطرے سے بچا لیا جائے۔ حضرت عثمان کے اِس فعل سے پوری اُمت نے اتفاق کیا ہے اور اِسے اُن کی عظیم ترین حسنات میں شمار کیا گیا ہے۔ لیکن بہرحال یہ اِس امر کی صریح نظیر تو ہے کہ تعبّدی اُمور میں بیشی ہی نہیں، کمی بھی کی گئی ہے اور اسے کسی صاحبِ علم نے بدعت نہیں سمجھا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ

---

[1] حضرت ابوبکرؓ نے جو قرآن لکھوایا تھا وہ حضرت حفصہ کے پاس تھا۔ اِس روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ صحیفوں کی شکل میں تھا، مگر دوسری روایات میں یہ ہے کہ وہ ایک ہی صحیفہ تھا، اور اہل علم میں مشہور بات یہی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے قرآن کو ایک مُصحف میں جمع کر دیا تھا۔ امام بدر الدین زرکشی البرھان میں اور امام سیوطی الاتقان میں اسی کو صحیح قرار دیتے ہیں۔

[2] اِس میں اختلاف ہے کہ یہ کتنے مصحف تھے۔ مشہور یہ ہے کہ یہ پانچ تھے جن میں سے ایک مدینے میں رکھا گیا تھا اور باقی دوسرے مرکزی مقامات پر بھیج دیے گئے۔ مگر ابو حاتم سجستانی کی روایت یہ ہے کہ سات نسخے تھے جن میں سے ایک مدینے میں رکھا گیا اور باقی مکہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ اور کوفہ بھیجے گئے۔ یہی بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

نے ابن ابی داؤد کے حوالہ سے سُوَید بن غَفَلَہ کی روایت نقل کی ہے کہ حضرت عثمانؓ نے یہ کام صحابہ کے مشورے سے کیا تھا۔ مگر اس سے بات اور بھی زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے، کیونکہ صحابہ شریعت کے خلاف مشورہ دینے کے ہرگز مجاز نہ تھے، لہٰذا جب اُنہوں نے سات توقیفی قرأتوں میں سے چھ کم کرنے اور صرف ایک باقی رکھنے کی رائے دی، درآنحالیکہ اللہ اور اس کے رسول کا کوئی حکم اِس کے حق میں موجود نہ تھا، تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ مصلحتِ اسلام و مسلمین کے لیے ان کے نزدیک ایسا کرنا شرعاً جائز ہی نہیں، دین کے اندر فتنے کے امکانات کا سدِ باب کرنے کے لیے واجب بھی تھا، اگرچہ اپنی ظاہری شکل کے لحاظ سے یہ ایک احداث فی الدین تھا۔

(باقی)

مطبوعات

مسیح موعود کی پہچان قرآن وحدیث کی روشنی میں

تالیف: مولانا مفتی محمد شفیع صاحب
شائع کردہ: مکتبہ دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴

قیمت: ایک روپیہ پچیس پیسے

یہ قابلِ قدر کتابچہ جس تصنیف یعنی علاماتِ قیامت اور نزولِ مسیح کا ایک باب ہے۔ اس پر ان صفحات میں تبصرہ ہو چکا ہے۔ مکتبہ دارالعلوم نے اس باب کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر اسے الگ پمفلٹ کی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ اس مختصر سے رسالہ میں آخر زمانہ میں آنے والے مسیح علیہ السلام کی تمام نشانیاں اور علامات بحوالہ قرآن وحدیث جمع کر دی گئی ہیں تاکہ ہر دیکھنے والا ایک نظر دیکھ سکے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مسیح موعود کی جو علامات بیان کی ہیں وہ مرزا غلام احمد قادیانی میں موجود ہیں یا نہیں۔ فاضل مصنف نے اس حقیقت کو اجاگر کرنے کے لیے اور عوام کے اندر ان علامات کی صحیح پہچان پیدا کرنے کے لیے انہیں ایک جدول کی صورت میں پیش کیا ہے جس کے ایک خانے میں آنے والے مسیح علیہ السلام کی علامات درج کی گئی ہیں اور دوسرے خانے میں قرآن یا حدیث کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔

یہ مفید رسالہ اس قابل ہے کہ اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے۔

ISLAM — ITS MEANING AND MESSAGE

مرتب: پروفیسر خورشید احمد صاحب
پیش لفظ: سالم عزام
شائع کردہ: اسلامک کونسل آف یورپ لندن

صفحات ۲۷۹ قیمت: درج نہیں۔

یورپ میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کی جو منظم کوششیں ہو رہی ہیں اُن سے دنیا اب پوری طرح واقف

ہے یہ ان کوششوں کا ہی ثمرہ ہے کہ دین کے نام پر بعض دشمنانِ دین جس قسم کی گمراہیاں پھیلا رہے تھے اُن کا پردہ بھی چاک ہوتا جا رہا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب اہلِ مغرب کو دینِ حق سے آشنا کرنے کی بڑی کامیاب کوشش ہے۔ اس کتاب کو فاضل مرتب نے اس حکیمانہ انداز سے ترتیب دیا ہے کہ اسلامی تعلیمات کے قریب قریب سارے گوشے بیک وقت آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں اور ایک قاری کو اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ اللہ کا دین عبادات، معیشت، معاشرت، سیاست، قانون اور اخلاق کے بارے میں کیا ہدایات دیتا ہے اور زندگی کے ان سارے دائروں میں اس کا موقف دوسرے نظامہائے حیات خصوصاً مغربی تہذیب سے کس طرح مختلف ہے۔

کتاب چار حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصّے میں زندگی کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کی گئی ہے دوسرے حصّے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ طیبہ بیان کی گئی ہے۔ تیسرے حصّے میں اسلامی نظامِ حیات کے مختلف شعبوں کے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں اور چوتھے حصّے میں اسلام اور عہدِ جدید کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب میں جو مضامین شامل ہیں وہ دورِ جدید کے بالغ نظر مسلم مفکرین کی کاوشِ فکر کے نتائج ہیں مثلاً مولٰنا سید ابوالاعلیٰ مودودی، جناب محمد اسد، پروفیسر خورشید احمد، مسٹر اے کے بروہی الاستاذ مصطفٰے احمد زرقا، سیّد قطب شہید، محمد قطب۔ سیّد حسین نصر۔ ٹی۔ بی۔ ارونگ محمد عمر چوپڑا — عبدالرحمٰن عزّام۔

طباعت کا معیار بہت عمدہ ہے البتہ پروف ریڈنگ کی طرف کماحقہٗ توجہ نہیں دی گئی۔

حسن البنا شہیدؒ
سرِ محفل

ترجمہ: جناب محمد حنیف ایم اے
شائع کردہ: مکتبہ چراغِ اسلام بیرون کھیالی دروازہ۔ گوجرانوالہ
صفحات ۲۲۴ قیمت: سوا آٹھ روپے

زیرِ نظر کتاب حسن البنّا شہید کے معروف مقالات کے ایک مجموعے "احادیث الجمعہ" کا اُردو ترجمہ ہے۔ ان مقالات کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اللہ کے اس مخلص بندے نے کس عزمِ صمیم اور کس خلوص اور ذہنی پاکیزگی کے ساتھ اور کس قسم کے نامساعد حالات میں اللہ کے دین کو سربلند کرنے کے لیے بھرپور جدوجہد کی۔ ان مقالات کا مطالعہ انسان کے اندر اسلام سے محبت اور اسے دوسرے ادیان پر غالب کرنے کی اُمنگ پیدا کرتا ہے۔ اگر ان مقالات کو دیہاتی حلقوں میں پڑھ کر سنایا جائے تو اس سے مفید نتائج پیدا ہو سکتے ہیں تبصرہ نگار

کے نزدیک ان مقالات کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ سننے والے کو قرآن مجید سے کافی حد تک قریب کر دیتے ہیں کیونکہ ان میں اللہ کے کلام کی عام فہم انداز میں تشریح کی گئی ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ البتہ نظر ثانی کا محتاج ہے۔ اس میں فاضل مترجم نے بعض ایسی تراکیب استعمال کی ہیں جو نامانوس ہونے کی وجہ سے ذہن پہ بار محسوس ہوتی ہیں مثلاً پہلے ہو گزرنے والوں میں سے ص۱۳، گرجدار آواز سے لوگوں کے بڑے بڑے ہجوموں کو اللہ کی طرف چلا لیا تھا، نبوت کی وراثت ان کی عادات واطوار میں مجسم ہو کر سامنے آگئی تھی ص۱۵۔ لفظ متلاشی آجکل بکثرت استعمال ہوتا ہے لیکن فارسی اور عربی کا یہ پیوند محل نظر ہے۔

معراج المومنین	تالیف: مولوی محمد عبدالمعز رحمانی

ناشر: عبدالحق ۱۷۵/اے یونٹ ۱۰۔ لطیف آباد۔ سندھ۔

صفحات ۹۴ قیمت درج نہیں۔

اس مفید کتابچے میں نماز اور اس کے متعلقات، مثلاً مقصد نماز، اس کی تاکید، اس کی فضیلت، نماز میں خشوع وخضوع اور حضور قلب اور نماز کے اندر پڑھی جانے والی مختلف دعاؤں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ نیز اس میں اقامت صلوٰۃ اور اس کے صحیح طریقے بھی درج ہیں جو قرآن وحدیث سے مستنبط ہیں۔ نماز دین کا ستون ہے اور اسے پابندی کے ساتھ ادا کرنے ہی سے ایک مسلمان کا دین درست اور اس کا خدا کے ساتھ تعلق استوار ہوتا ہے۔ کراچی میں یہ کتاب درج ذیل پتہ پر مفت مل سکتی ہے۔

حاجی عبدالرشید اے بہار مسلم سوسائٹی بلاک ۵/۱ کراچی ۵

(بقیہ صیہونی اسرائیلیوں کی مسلم آزاری) اور اب بھی عیسائی آبادیوں کے ممالک ہی اسرائیلی ریاست کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ لیکن میں یہ جان کر حیرت زدہ ہوں کہ یہودیوں نے عیسائی معابد اور مذہبی ادارات پر بھی خوب ہاتھ صاف کیا۔ اس کی وجہ غالباً رومن کیتھولک فرقے کے خلاف ان کا غیظ و غضب تھا۔

میرے سامنے ایک بڑی جامع رپورٹ ہے جو دراصل مختلف اُسقفوں اور پادریوں کے فریادناموں کا مجموعہ ہے جن کی نقول اقوام متحدہ، انٹرنیشنل ریڈ کراس، وٹیکن اور اسرائیلی حکام کو بھجوائی گئیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ عیسائیوں کے مذہبی ادارات گولہ باریوں کا نشانہ بنائے گئے، ان میں اسرائیلیوں کے فوجی مراکز قائم کیے گئے، پادریوں اور ننّوں اور دوسری عورتوں اور بچوں کو حراست میں ڈالا گیا، فرنیچر، پیتل کا سامان، چاندی کے ظروف، کمبل، بستر، چادریں سٹیشنری اور دیگر تمام قیمتی چیزیں لُوٹ لی گئیں، صلیبیں اور مریم و عیسیٰ کے مجسمے اور ڈھانچے زمین پر گرا کر توڑے گئے۔ تصاویر کو پھٹ کر ان کے فریم اور شیشے تباہ کر دیے گئے۔ کتاب مقدس کے کلمات کے پلے کارڈ روندے اور پھاڑ دیے گئے۔ عمارتوں کے دروازے توڑ ڈالے گئے، مقام عبادت کو بیت الخلاء کے طور پر استعمال کیا گیا۔ بعض مقامات پر عیسائی ادارات کے عملے کے متعدد افراد مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ یروشلم کے چار مذہبی سربراہوں نے پوپ دوازدہم کے نام عرضداشت میں لکھا کہ "یہودیوں نے یروشلم کو آگ اور خون سے بھر دیا ہے اور عیسائی گرجوں، اسکولوں، ہسپتالوں اور اقامت گاہوں کو مورچوں میں بدل دیا ہے۔" عیسائیوں کے مقدس مقبروں پر گولہ باری کی گئی۔ اور کیا بیان کیا جائے۔[1]

رومن کیتھولک عیسائیوں کے خلاف ایسے اقدام کرنے والے یہودیوں نے وٹیکن کو اپنے سرمائے (اور چندوں) سے اس طرح رام کیا کہ با ضابطہ نمائندہ مذہبی مجلس نے یہودیوں کو حضرت عیسیٰؑ کو صلیب دلوانے کے الزام سے بری قرار دے دیا۔

مسلم مقاماتِ مقدسہ کی تخریب و توہین | مسلمانوں کے معابد، مقابر اور اوقاف کے خلاف یہودیوں کی کاروائیاں شدید قسم کے متعصبانہ جذبات اور ایک ردِّ عملی مجنونیت کی آئینہ دار ہیں۔ سب سے پہلے میں الاستعمار کا ایک مختصر اقتباس درج کر رہا ہوں۔

"یہود نے فلسطین میں کئی سو مسجدیں مسمار کر دیں اور انہیں مراکزِ لہو و لعب میں بدل دیا، جیسا کہ

---

[1] ملاحظہ ہو:- THE JEWS IN PALESTINE (BY THE UNION OF CHRISTIAN CHURCHES)

یافا میں جامع منشیہ معروف بہ جامع حسن بک پر کیا گیا۔ بعض مساجد کو یہودی کنیسوں میں بدل لیا گیا، جیسے کہ مسجد قدس میں مسجد نبی داؤد کی مثال سامنے ہے۔ یہود نے مسلمانوں کے قبرستانوں کی حرمت پامال کی، انہیں ملیا میٹ کر دیا، قبریں اکھیڑ دیں اور ان جگہوں پر گھر تعمیر کر دیے اور نو آمدہ یہودی مہاجرین کے لیے کالونیاں کھڑی کیں۔ اسلامی اوقاف اور ان کی اراضی اور املاک پر قبضہ کر لیا۔ مسلمانوں سے دینی شعائر اور احکام پر عمل کرنے کی آزادی چھین لی اور ان کو عیدوں اور دوسری تقریبوں کے اجتماعات سے محروم کر دیا جو قرونِ بعیدہ سے معمول میں داخل تھے۔ یہودی حاکموں نے شرعی اداروں، اوقاف اور بچی کھچی مساجد اور تمام اسلامی تعمیرات کو مقبوضہ فلسطین میں یہودی وزارتِ ادیان اور اس کے اداروں کے ماتحت کر دیا۔ خود حرمِ قدس شریف میں مکروہ حرکات کیں۔ مورخہ ۱۶، ۱۷ جولائی ۱۹۴۸ء (۹، ۱۰ ماہ رمضان ۱۳۶۷ھ) کو قدس پر حملہ کرتے ہوئے حرم کے اندر گھوڑے دوڑائے جن کی وجہ سے کثیر افراد کچل کر ہلاک ہو گئے[1]۔

"یروشلم میں یہودیوں نے لوٹ مار اور دہشت انگیزی کی، نیز تاریخی مسلم علاقے میں باب المغربہ کی اس مقصد سے تباہ کاری کی کہ اسرائیلی سیاحوں کے لیے کار پارکنگ کی جگہ بنائی جا سکے ....
عجائب گھر سے بحیرہ مردار کے علاقے سے حاصل شدہ دستاویزات کے طومار (DEAD SEA SCROLLS) چرا لیے گئے اور قدیم دستاویزات اور نوشتوں کے ایک تاجر کے ہاں سے ہیکل کی دستاویزات کے طومار (TEMPLE SCROLLS) زبردستی چھین لیے گئے[2]۔

"مسجدِ اقصیٰ اور مسجدِ صخرہ کے نیچے مشینوں سے کھدائی کی جا رہی ہے تاکہ ہیکل سلیمانی کی قدیم بنیادیں تلاش کی جائیں جسے رومن شہنشاہ ٹیٹس (TITUS) نے تباہ کر دیا تھا۔ اب ہیکل سلیمانی کی تعمیرِ نو کا مجوزہ نقشہ امریکی جرائد میں چھپ چکا ہے۔ اسے دیکھ کر کسی نامہ نگار نے سوال کیا کہ آخر ہیکل سلیمانی کی تعمیر کس طرح ہو گی جبکہ مجوزہ نقشے کے مطابق عین اسی مقام پر مسجد صخرہ موجود ہے۔ جواباً

---

[1] الاستاذ محمد الغزالی - الاستعمار، احقاد و اطماع - (دار السعودیۃ للنشر، جدہ، ۱۹۷۰) ص ۳۸۱

[2] ملاحظہ ہو:- ABDULLAH SCHLEIFER - "THE FALL OF JERUSALEM" THROUGH "CRITARION" KARACHI VOL: 9, NO: 12 (1974) P 26, UNDER THE HEADING BOOKS REVIEWS WRITTEN BY ISMAIL ZAYID,

کہا گیا کہ آخر زلزلے بھی تو آتے ہیں، اور ضروری نہیں کہ زلزلے ہمیشہ قدرت کے لائے ہوئے ہوں۔[۱]

اس موقع پر یاد آیا کہ ۲۱ اگست ۱۹۶۹ء وہ دردناک دن ہے جبکہ یہودیوں نے مسجد اقصیٰ میں آگ لگا کر اپنی پستئ دین واخلاق کا مظاہرہ کیا۔

یروشلم پر کیا گذری؟ | یروشلم پر جو کچھ گذری ہے اس کے بارے میں ایک جامع دستاویز "قدیم شہر یروشلم کی تخریب وتوہین" (بزبان انگریزی) میرے سامنے ہے جسے "خواتین عرب کی اطلاعات کمیٹی (THE ARAB WOMEN'S INFORMATION COMMITTEE BEIRUT) نے مرتب کیا اور "معرکۂ ماہ جون سوسائٹی" (THE FIGHT OF JUNE SOCIETY BEIRUT) نے شائع کیا ہے میں اس مفصل دستاویز کا خلاصہ پیش کرتا ہوں جس کے ابتدائی چند پیراگراف تاریخی لحاظ سے اذیتناک حالات کے تدریجی نشوونما کو واضح کرتے ہیں۔ حاشیے میں صفحات کے حوالوں کا اندراج کیا جارہا ہے۔

۷ رجون ۱۹۶۷ء کو اسرائیلی فوج نے قدیم شہر پر قبضہ کیا اور جنرل موشے دایان نے اعلان کیا کہ ہم نے یروشلم کو آزاد کرالیا ہے..... ہم اس عزم سے واپس آئے ہیں کہ اس سے پھر کبھی جدا نہ ہوں گے[۲]

۲۰ رجون کو ڈیوڈ بن گوریان (DEVID BEN GURION) نے اخبار یروشلم پوسٹ کے ذریعہ اعلان کیا کہ یروشلم حضرت داؤد کے زمانے میں اسرائیل کا مرکز حکومت رہا ہے، اور اب یہ ہمیشہ اسی حیثیت میں رہے گا۔ پھر جیوئش آبزرور (JEWISH OBSERVER) کے ذریعے اپنے احساسات یوں واضح کیے گئے کہ "یہ نہ صرف اسرائیل کا مرکز حکومت ہے بلکہ تمام یہودی قوم کے لیے مرکز ہے۔"[۳]

۷۱ رجون ۱۹۶۷ء کو اسرائیلی پارلیمنٹ (THE KNESSET) نے اپنے ایک سابق قانون ADMINISTE-RATIVE & LEGAL RULES ORDINANCE, 1948 میں اس مقصد سے ترمیم کی کہ یروشلم کو یہودی ریاست میں ضم کرنے کا اختیار حکومت کو حاصل ہو جائے۔[۴]

۲۸ رجون ۱۹۶۷ء کو حکومت کے سیکرٹری کا ایک حکم جاری ہوا جس کی رو سے ایک چارٹ میں دیے ہوئے نئے علاقے اسرائیلی حکومت کے انتظام میں دے دیے گئے۔ ان میں یروشلم کا وہ میونسپل علاقہ بھی شامل تھا جو اُردن کے زیر انتظام تھا اور ایک لاکھ عرب (بیشتر مسلمان - صدیقی) اس میں آباد تھے۔[۵]

۲۹ رجون ۱۹۶۷ء کو (تاریخوں کو سامنے رکھ کر ذرا کارروائی کی تیز رفتاری دیکھیے۔ صدیقی) اسرائیلی حفاظتی فوج نے

---

[۱] M.W. GARDAR— HIS ARTICLE "PLISTINE & CRESCENT" IN VOICE OF ISLAM, VOL. IX, NO: 6 (1970) P-15.

[۲] تا [۵] "قدیم شہر کی تخریب وتوہین" ("THE RAPE OF THE OLD CITY" P1, COLUMN. 1.)

ایک حکم کے ذریعے یروشلم کے عرب علاقے کے باشندوں کی منتخب کردہ میونسپل کونسل کو توڑ کر میئر کو برطرف کردیا اور عرب میونسپلٹی کے ملازمین کو اسرائیلی میونسپلٹی میں منتقل کردیا[۱]۔

۴ر اور ۱۴ر جولائی ۱۹۶۷ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۲ قراردادیں، نمبر ۲۲۵۳ اور نمبر ۲۲۵۴ پاس کیں جن میں اسرائیل سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ ایسے تمام اقدامات کو منسوخ کردے اور آئندہ ایسی کارروائیوں سے باز رہے جو یروشلم کی حیثیت کو تبدیل کرنے کی باعث ہوں[۲] - (اقوام متحدہ کی تقریباً تمام قراردادوں کو اسرائیل نے بے وقعت بنادیا - ان قراردادوں کی تفصیل میرے سامنے ہے[۳])

یو.پی.آئی کے ڈسپیچ مورخہ ۱۰ر جولائی ۱۹۶۷ء میں وزیر اعظم اسرائیل لیوی اشکول نے کہا کہ "اسرائیل بغیر یروشلم کے ایسے ہے جیسے وہ سر بریدہ ہو" اور اے.ایف.پی آئی کے دوسرے ایک مراسلے کے مطابق اسرائیل کے فوجی دستے نے یہ منظر دیکھنے کی تمنا کا اظہار کیا ہے کہ عین مقدس مسلم معبد الاقصیٰ کی زمین پر یہودی ہیکل کی تعمیر ہو.... اور ٹائم میگزین مورخہ ۲۰ر جون ۱۹۶۷ء کی رپورٹ کے مطابق یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے جبکہ اسلام کے مقدس گنبدِ صخرہ کو ڈھادیا جائے[۴]۔

مشہور جریدے کرسچین مانیٹر مورخہ ۱۲ر ستمبر ۱۹۶۷ء کا بیان ہے کہ اسرائیلی کیبنٹ نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے پولیس ہیڈ کوارٹرز کو یروشلم میں منتقل کردے[۵]۔

یروشلم پوسٹ مورخہ ۱۰ر اکتوبر ۱۹۶۷ء میں یروشلم کے نئے اسرائیلی میئر (MR. TEDDY KOLLEK) کا یہ اعلان شائع ہوا کہ یروشلم میں ایک مذہبی مزاج کی (یہودی) تنظیم کا دستہ مامور کیا جائے گا - نیز یہ بھی کہ قدیم شہر کے یہودی نوآبادکاروں کے لیے دو ہزار کی تعداد میں ایسی مستقل سپاہ آئندہ دو سال کے اندر فراہم کردی جائے گی[۶]۔

۲۷ر اپریل ۱۹۶۸ء کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے متنبہ کیا کہ وہ یروشلم میں (اعلان کردہ) فوجی پریڈ منعقد کرنے سے باز رہے - لیکن اسرائیل نے اس انتباہ کو نظر انداز کردیا اور جشن منعقد ہوا (یہ تو اس کی مستقل شان ہے ہی! صدیقی)

پھر ۲ر مئی کو سیکورٹی کونسل نے ایک اور قرارداد نمبر ۱۹۶۸/ ۲۵۱ پاس کی جس میں اسرائیل کی طرف سے سابق فوجی قرارداد کی توہین کرنے کے خلاف غم وغصہ کا اظہار کیا گیا[۷]۔

۲۱ر مئی ۱۹۶۸ء کو سلامتی کونسل نے قرارداد نمبر ۲۵۲ پاس کرکے اسرائیل کی طرف سے ۴ر اور ۱۴ر جولائی کی قراردادوں کی توہین پر پھر غم وغصہ کا اظہار کیا گیا[۸]۔ (اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل اسرائیلیوں کے خلاف غم وغصہ کی قراردادیں پاس کرنے میں بڑی سرگرم رہی ہے - صدیقی)[۹]

۱؎ THE RAPE OF THE OLD CITY P. 1. COLOMN: 1 ۴؎ IBID P:1, COL: 2.

۲؎ ISMAIL ZAYID, PALISTINE A STOLEN HERITAGE (1974) P: 26.

۳؎، ۵؎، ۶؎، ۷؎، ۸؎، ۹؎ THE RAPE OF THE OLD CITY, P: 2, COL: 1.

اپریل ۱۹۶۹ء میں ایک یہودی جریدے (HAOLAM HAZEH) میں عارف العارف (AREF-EL-AREF) کی رپورٹ شائع ہوئی جو یروشلم میں رہنے والا عرب مورخ ہے اور اپنے شہر کی بربادی کا عینی شاہد۔ وہ کہتا ہے کہ اب تک (یعنی آج سے چھ[۶] سال قبل) اسرائیلیوں نے ۱۴۵ مکان ملیامیٹ کیے ہیں، انہوں نے قدیم یروشلم کی ۱۲۳۰ عمارات کو ضبط کرلیا ہے، ان عمارات میں ۱۳۰۸ سکونتی ہیں، ۴۳۸ دکانیں ہیں، ۵ مسجدیں اور ۴ سکول ہیں۔ وہ ایک ایک کرکے عمارات کو اس دعوے کے ساتھ تباہ کرتے ہیں کہ یہ خدمتِ عامہ کا تقاضا ہے...... ارباب اختیار نے عرب یروشلم کے اندر شیخ جراح کے علاقے میں ۸۳۶٫۲۵ ایکڑ اراضی کو بھی ضبط کرلیا ہے۔[۱]

۲۲ فروری ۱۹۶۹ء کو ایک نئے قانون کے نفاذ کا اعلان کیا گیا جس کا مقصد تمام عرب پیشہ وروں، صنعت کاروں اور سوسائیٹیوں کی غیر منقولہ جائدادوں کو اسرائیلی قانون کے تابع کرنا تھا۔[۲]

۱۵ ستمبر ۱۹۶۹ء کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے قرارداد نمبر ۲۷۱ میں مسجد اقصیٰ کو نقصان پہنچانے کی بناء پر اسرائیلیوں کی مذمت کی۔[۳]

اگست ۱۹۷۰ء میں یروشلم کے سابق برطرف شدہ میئر روحی الخطیب نے ضبط شدہ اراضی کے اعداد وشمار پیش کیے اور بتایا کہ ایسا مجموعی رقبہ ۴۲۲۰ ایکڑ ہے۔ اس کے چند ہی روز بعد عبرانی جریدے (DAVAR) نے ۴ ستمبر ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں بتایا کہ متذکرہ اعداد وشمار میں مزید ۳۵ سو ایکڑ کا اضافہ ہوچکا ہے۔[۴]

ٹائمز کی اشاعت ۲۰ دسمبر ۱۹۷۰ء۔ راوی ہے کہ بین الاقوامی ماہرین تعمیرات کی ایک کانگریس نے یروشلم کی ترقی کے کام پر طویل المیعاد اسرائیلی منصوبوں کے متعلق گہری تشویش کا اظہار کیا۔ اس سلسلے میں دور پرے کے (یہودی) سٹہ بازوں کی نفع پرستی پر تنقید بھی کی گئی جس کی وجہ سے عین اُس مدعا کی جڑ کٹ جائے گی جس نے یروشلم کو بے مثال مقام دیا ہے۔ اصل اسرائیلی منصوبے (۱۹۶۸ء) میں ترمیم کرکے ہاؤسنگ منسٹری نے نبی سموئیل کی پہاڑی پر (۴ تا ۱۸ ہزار کے بجائے) ۵۰ ہزار نو آمدہ یہودیوں کی بستیاں بسانے کا فیصلہ کیا۔[۵]

متذکرہ کانگریس کی یروشلم برانچ کے صدر نے ردوبدل کی اس عاجلانہ کارروائی پر انتباہ دیا کہ یروشلم کے مخصوص حُسن کو غارت کرنا بری سیاست کاری ہے...... ایک اطالوی ماہر تعمیرات نے کہا کہ شہر میں گھومنے کے بعد اس کی طبیعت پریشان اور مضطرب ہے۔[۶] (باقی)

[۱، ۲، ۳، ۴] THE RAPE OF THE OLD CITY P: 2 COL-1

[۵] THE RAPE OF THE OLD CITY P. 2, COL: 2 [۶] IBID. P: 2 COL: 1, 2